رجب المرجب ۱۴۴۲ھ

جون ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمد

انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقتِ انسان
”اربعین نووی“ کی ایک حدیث کی تفہیم
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 61

شمارہ : 6

رجب المرجب 1433ھ

جون 2012ء

فی شمارہ -/25

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرونِ ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 3
دفاعِ پاکستان —— مگر کیسے؟
ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 5
سورۃ التوبۃ (آیات ۱ تا ۲۹)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب — 31
انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقتِ انسان
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت — 47
بخالت: تباہ کن خصلت
عتیق الرحمٰن صدیقی

اقبالیات — 57
علامہ اقبال کی قرآن فہمی
محمد احمد بلال

دعوتِ فکر — 67
حقوق و فرائض (۲)
بیگم ڈاکٹر عبد الخالق

حسنِ معاشرت — 73
موبائل فون کے فوائد و نقصانات اور استعمال کے آداب
حافظ شعیب احمد

تحریکِ تجدّد و متجدّدین — 81
مولانا وحید الدین خان: اپنے الفاظ کے آئینے میں (۴)
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دفاعِ پاکستان — مگر کیسے؟

پاکستان یقیناً دنیا کا واحد ملک ہے جس کے بارے میں ایک عرصہ سے اندرونی و بیرونی طور پر اس طرح کے خدشات کا اظہار ہوتا رہتا ہے کہ اس کی سلامتی شدید خطرہ سے دوچار ہے — یہ ملک ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت کا شکار ہونے والا ہے — اس کا نام و نشان دنیا کے نقشہ سے مٹ جانے کو ہے۔ بعض افراد یا ادارے تو باقاعدہ وقت کا تعین بھی کر دیتے ہیں۔ کبھی ۲۰۰۵ء' کبھی ۲۰۱۵ء اور کبھی ۲۰۲۰ء بطور ٹارگٹ دیے گئے۔ المیہ یہ ہے کہ خود پاکستان کی حکومت جس کے ذمہ پاکستان کی سلامتی اور خود مختاری کی حفاظت ہے اور جس کے ارکان حلف اٹھاتے وقت غیر مبہم انداز میں اقرار کرتے ہیں کہ پاکستان کی سلامتی اور خود مختاری اُن کا مقدس فریضہ ہے' وہ بھی صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ ملک شدید خطرات سے دوچار ہے اور ہم تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک خدشات و خطرات کے درست ہونے کے باوجود ابھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ ابھی معاملات پوائنٹ آف نو ریٹرن تک نہیں پہنچے۔ ویسے بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم مایوسی کو کفر جانتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کسی ملک کے دفاع کے حوالہ سے بات ہو گی تو فوراً ذہن اِن امور کی طرف منتقل ہو گا۔ مثلاً اس ملک کا جغرافیائی محل وقوع کیسا ہے؟ اس کی فوج پروفیشنل ہے یا نہیں؟ جرأت و بہادری اور مورال کا معاملہ کیسا ہے؟ فوج کو جدید ترین اسلحہ میسر ہے یا نہیں؟ گولہ و بارود کی فراہمی کیسی ہے؟ فوج کو move کرنے کے لیے کثیر مقدار میں پٹرول ڈیزل وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے' اس کے ذخیرے کی کیا صورت ہے؟ مواصلاتی نظام کس قدر جدید اور محفوظ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یقیناً کسی ملک کے دفاع کو مضبوط اور محفوظ بنانے کے لیے یہ سب کچھ انتہائی اہم ہے اور جنگ سر پر آ جائے تو اِن ہی حوالہ جات سے تیاری فیصلہ کن ثابت ہو گی۔ لیکن یہ کہنا کسی طرح بھی مبالغہ نہیں ہو گا کہ فرد' معاشرے اور ریاست کا روزمرہ معمولاتِ زندگی کے حوالہ سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر طرزِ عمل بھی دفاعِ وطن کے حوالہ سے کسی طرح کم اہم نہیں ہوتا۔ ہم کچھ عنوانات طے کر کے پھر پاکستان کو اس ترازو میں تولیں گے' تاکہ معلوم ہو سکے کہ دفاعی کمزوریاں کیا کیا ہیں اور انہیں کیسے رفع کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اَخلاقی اقدار: دنیا بھر میں اخلاقی اقدار کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہیں' کسی ملک کے مسلم یا غیر مسلم ہونے سے اخلاقی اقدار میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً سچ اور ایفائے عہد دونوں اخلاقی اقدار ہیں۔ ہم اس حوالہ سے کہاں کھڑے ہیں؟ اسے جانچنا ہو تو سیاست دانوں کی جلسوں میں تقریریں سماعت فرمائیں' خصوصاً انتخابات میں' جب وہ انتخابی جلسوں سے خطاب کر رہے ہوتے ہیں تو جان بوجھ کر یا جوشِ

خطابت میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں اور ایسے ایسے وعدے کر لیتے ہیں جنہیں عملی طور پر پورا کرنے کی وہ سوچ بھی نہیں رکھتے۔ یعنی آپ کو ۸۰'۹۰ فیصد سننے کو جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ عہد نبھانے کے حوالہ سے ہماری سوچ کیا ہے' اُسے جاننے کے لیے صدرِ پاکستان آصف علی زرداری کا وہ فرمودہ کافی ہے کہ وعدہ کوئی قرآن' حدیث ہے جسے پورا کرنا ضروری ہو؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کا یہ فرمان کسی تبصرے کا محتاج نہیں اور معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کی پیمائش کرنے کے لیے کسی دوسرے پیمانے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ پر نگاہ ڈالیں' پاکستان تو کسی کھاتے میں نہیں آتا' دنیا کی عظیم سلطنتیں اور بڑی بڑی سپر قوتیں جب زوال پذیر ہوئیں تو اُس کا آغاز اخلاقی گراوٹ سے ہوا۔

(۲) قانون کی بالادستی: جس ملک میں قانون کی بالادستی قائم نہیں ہو گی' کمزور اور طاقتور کے لیے الگ الگ قوانین ہوں گے یا دونوں پر قانون کا اطلاق یکساں نہیں ہو گا' وہ کبھی ایک مضبوط اور مستحکم معاشرے اور ریاست کی صورت اختیار نہیں کر سکے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے برملا فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں اس لیے ہلاک کر دی گئیں کہ وہ غریب اور کمزور کو انصاف مہیا نہیں کرتی تھیں۔ قبیلہ بنو مخزوم کی فاطمہ نامی خاتون کو چوری کی سزا سے معاف کر دینے کی سفارش پر آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک غصہ سے لال ہو گیا اور فرمایا کہ اگر (معاذ اللہ) فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اُس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔ آپ ﷺ تو بہر حال محسنِ انسانیت تھے اور ہر شعبہ میں ایسی نظیریں قائم کیں کہ آج تک دنیا حیران اور لاجواب ہے' آج کے دور میں غیر مسلموں نے عدل و انصاف کو دفاعِ وطن کے حوالہ سے اہم ستون سمجھا ہے۔ کہتے ہیں جنگ عظیم دوم کے دوران وزیر اعظم وِنسٹن چرچل لندن ہائی کورٹ جا پہنچے اور چیف جسٹس سے پوچھا کیا ہماری عدالتیں عوام کو انصاف فراہم کر رہی ہیں؟ (یہ وہ وقت تھا جب انگریز افواج کو میدانِ جنگ میں سنگین مشکلات کا سامنا تھا) چیف جسٹس نے پورے یقین اور اعتماد سے کہا کہ جی ہاں ہماری عدالتیں عوام کو انصاف فراہم کر رہی ہیں۔ اس پر وِنسٹن چرچل نے کہا کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ فتح ہماری ہو گی!

(۳) مالی نظم وضبط اور احتساب: آج کے دور بلکہ ہر دور میں ہی دفاعِ وطن کے لیے کسی قوم کا مالی طور پر خود کفیل ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ دفاعِ وطن کے لیے بہر حال وسائل کی فراہمی انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر کسی قوم کے ہاتھ میں کشکول ہے اور وہ در در بھیک مانگ رہی ہے تو لازماً اُسے دفاع کے حوالہ سے اپنے بعض بنیادی معاملات سے انحراف کرنا پڑے گا۔ پاکستان کی موجودہ حالت اس کی بہترین مثال ہے۔ قرض اور امداد مانگنے والے کی آنکھیں زمین سے اوپر نہیں اٹھ سکتیں۔

(۴) حکومت کا ہر دلعزیز ہونا: کسی ملک کے مضبوط دفاع کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہاں ہر دلعزیز حکومت ہو۔ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ جمہوری طرزِ حکومت میں جہاں عوام کے نمائندہ ہونے کے نعرے بڑے زوردار انداز میں لگائے جاتے ہیں اُس کا ہر دلعزیز ہونا کسی طور ضروری نہیں ہے۔ مثلاً اگر کسی ملک میں چار جماعتیں (یا صدارتی طرزِ حکومت میں چار افراد) انتخابات میں حصہ لے رہی ہوں اور ووٹوں کی تقسیم کچھ یوں ہو: ۱۵ فیصد' ۲۵ فیصد' ۲۸ فیصد' ۳۲ فیصد' تو آخری یعنی ۳۲ فیصد فیصد والا جیت جائے گا۔ گویا

(باقی صفحہ 96 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ التَّوبۃ

تمہیدی کلمات

سورۃ التوبہ کئی خطبات پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر خطبہ الگ پس منظر میں نازل ہوا ہے۔ جب تک ان مختلف خطبات کے پس منظر اور زمانۂ نزول کا الگ الگ تعین درست انداز میں نہ ہو جائے' متعلقہ آیات کی درست توضیح و تشریح کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس سورت کی تفسیر کرتے ہوئے پوری احتیاط سے تحقیق نہیں کی' وہ خود بھی مغالطّوں کا شکار ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ سورت قرآن حکیم کی مشکل ترین سورت ہے اور اس کی تفہیم کے لیے انتہائی محتاط تحقیق اور گہرے تدبّر کی ضرورت ہے۔

سورۃ التوبہ اور حضورﷺ کی بعثت کے دو پہلو: محمدٌ رسول اللہﷺ سے قبل ہر پیغمبر کو ایک خاص علاقے اور خاص قوم کی طرف مبعوث کیا گیا' مگر آپؐ اپنی قوم (بنو اسماعیل) کی طرف بھی رسول بن کر آئے اور قیامت تک کے لیے پوری دنیا کے تمام انسانوں کی طرف بھی۔ یہ فضیلت تمام انبیاء و رُسل میں صرف آپﷺ کے لیے مخصوص ہے کہ آپؐ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا گیا' ایک بعثتِ خصوصی اور دوسری بعثتِ عمومی۔ آپؐ کی بعثت کے ان دونوں پہلوؤں کے حوالے سے سورۃ التوبہ کی آیات میں بھی ایک بڑی خوبصورت تقسیم ملتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس سورت کے بھی بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ آپﷺ کی۔ بعثت کے خصوصی پہلو سے متعلق ہے' جبکہ دوسرے حصے کا تعلق آپؐ کی بعثت کے عمومی پہلو سے ہے۔ چنانچہ سورت کے ان دونوں حصوں کے موضوعات و مضامین کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے حضورﷺ کی بعثت کے ان دونوں پہلوؤں کے فلسفے کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

حضورﷺ کی بعثتِ خصوصی: محمد عربیﷺ کی خصوصی بعثت مشرکین عرب یا بنو اسماعیل کی طرف تھی۔ آپؐ کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا اور آپﷺ نے ان لوگوں کے اندر رہ کر' خود ان کی زبان میں' اللہ کا پیغام اُن تک پہنچا دیا اور ان پر آخری حد تک اتمامِ حجت بھی کر دیا۔ اسی ضمن میں پھر مشرکینِ عرب پر اللہ کے اس قدیم قانون کا نفاذ بھی عمل میں آیا کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے اور وہ رسول اپنی دعوت کے سلسلے میں اس قوم پر اتمامِ حجت کر دے' پھر اگر وہ قوم اپنے رسول کی دعوت کو رد کر دے تو اس پر عذابِ استیصال مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مشرکینِ عرب پر عذابِ استیصال کی نوعیت معروضی حالات کے پیش نظر پہلی قوموں کے مقابلے میں مختلف نظر آتی ہے۔ اس عذاب کی پہلی قسط غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کی ہزیمت و شکست کی صورت میں سامنے آئی جبکہ دوسری اور آخری قسط کا ذکر اس سورت کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ بہر حال اپنی بعثتِ خصوصی کے حوالے سے حضورﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں دین کو غالب کر دیا' اور وہاں آپﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اقامت دین کا عملی نقشہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا۔

حضورﷺ کی بعثتِ عمومی: نبی اکرمﷺ کی بعثت عمومی پوری انسانیت کی طرف قیامت تک کے لیے ہے۔ اس سلسلے میں دعوت کا آغاز آپﷺ نے صلح حدیبیہ (۶ ہجری) کے بعد فرمایا۔ اس سے پہلے آپﷺ نے کوئی مبلغ یا داعی عرب سے باہر نہیں بھیجا' بلکہ تب تک آپؐ نے اپنی پوری توجہ جزیرہ نمائے عرب تک مرکوز رکھی اور اپنے تمام وسائل اسی خطہ میں دین کو غالب کرنے کے لیے صرف کیے۔ لیکن جونہی آپﷺ کو اس سلسلے میں ٹھوس کامیابی ملی' یعنی قریش نے آپﷺ کو بطورِ فریق ثانی کے تسلیم کر کے آپﷺ سے صلح کر لی' (قرآن نے سورۃ الفتح کی پہلی آیت میں اس صلح کو ''فتح مبین'' قرار دیا ہے) تو آپؐ نے اپنی بعثت عمومی کے تحت دعوت کا آغاز کرتے ہوئے عرب سے باہر مختلف سلاطین و امراء کی طرف خطوط بھیجنے شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں آپؐ نے جن فرمانرواؤں کو خطوط لکھے' اُن میں قیصر روم' ایران کے بادشاہ کسریٰ' مصر کے بادشاہ مقوقس اور حبشہ کے فرمانروا نجاشی (یہ عیسائی حکمران اس نجاشی کا جانشین تھا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا' اور جن کی غائبانہ نمازِ جنازہ حضورﷺ نے خود پڑھائی تھی) کے نام شامل ہیں۔ [نوٹ: ماضی قریب میں یہ چاروں خطوط اصل متن کے ساتھ اصل شکل میں دریافت ہو چکے ہیں۔] آپؐ کے انہی خطوط کے ردِّ عمل کے طور پر سلطنتِ روما

کے ساتھ مسلمانوں کے ٹکراؤ کا آغاز ہوا‘ جس کا نتیجہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں جنگِ موتہ اور غزوۂ تبوک کی صورت میں نکلا۔ بہر حال ان تمام حالات و واقعات کا تعلق آپ ﷺ کی بعثتِ عمومی سے ہے‘ جس کی دعوت کا آغاز آپ ﷺ کی زندگی مبارک ہی میں ہو گیا تھا‘ اور پھر خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے واضح طور پر یہ فریضہ اُمت کے ہر فرد کی طرف منتقل فرما دیا۔ چنانچہ اب تا قیامِ قیامت آپ ﷺ پر ایمان رکھنے والا ہر مسلمان دعوت و تبلیغ اور اقامتِ دین کے لیے محنت و کوشش کا مکلف ہے۔

موضوعات:

مضامین و موضوعات کے حوالے سے یہ سورت دو حصوں پر مشتمل ہے‘ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

حصہ اوّل: یہ حصہ سورت کے پہلے پانچ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ خصوصی کے تکمیلی مرحلے سے ہے۔ آیات کی ترتیب کے مطابق اگرچہ یہ پانچ رکوع بھی مزید تین حصوں میں بٹے ہوئے ہیں‘ مگر موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ حصہ ہمیں دو خطبات پر مشتمل نظر آتا ہے‘ جن کا الگ الگ تعارف ذیل کی سطور میں دیا جا رہا ہے۔

پہلا خطبہ: پہلا خطبہ دوسرے اور تیسرے رکوع پر مشتمل ہے اور یہ فتح مکہ (۸ ہجری) سے پہلے نازل ہوا۔ ان آیات میں مسلمانوں کو فتح مکہ کے لیے نکلنے پر آمادہ کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ بہت نازک اور حساس تھا۔ مسلمان مہاجرین کی مشرکینِ مکہ کے ساتھ براہِ راست قریبی رشتہ داریاں تھیں‘ ان کے خاندان اور قبیلے مشترک تھے‘ حتیٰ کہ بہت سے مسلمانوں کے اہل و عیال مکہ میں موجود تھے۔ کچھ غریب‘ بے سہارا مسلمان‘ جو مختلف وجوہات کی بنا پر ہجرت نہیں کر سکے تھے‘ ابھی تک مکہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر جنگ ہوگی‘ مکہ پر حملہ ہوگا تو ان سب کا کیا بنے گا؟ کیا گندم کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا؟ دوسری طرف قریش مکہ کا بظاہر یہ اعزاز بھی نظر آتا تھا کہ وہ بیت اللہ کے متولی تھے اور حجاج کی خدمت کرتے تھے۔ اس حوالے سے کہیں سادہ دل مسلمان اپنے خدشات کا اظہار کر رہے تھے تو کہیں منافقین ان سوالات کی آڑ لے کر لگائی بجھائی میں مصروف تھے۔ چنانچہ ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ پس منظر مدنظر رہنا چاہیے۔

دوسرا خطبہ: دوسرا خطبہ پہلے‘ چوتھے اور پانچویں رکوع پر مشتمل ہے اور یہ ذوالقعدہ ۹ ہجری

کے بعد نازل ہوا۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس میں سے پہلی چھ آیات کو مقدم کر کے سورت کے آغاز میں لایا گیا ہے۔ یہ وہی آیات ہیں جن کے ساتھ حضور ﷺ نے حضرت علی ؓ کو قافلۂ حج کے پیچھے بھیجا تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ۹ ہجری میں حضور ﷺ خود حج پر تشریف نہیں لے گئے تھے‘ اس سال آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا۔ حج کا یہ قافلہ ذوالقعدہ ۹ ہجری میں روانہ ہوا اور اس کے روانہ ہونے کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی ؓ کو بھیجا کہ حج کے موقع پر علی الاعلان یہ احکامات سب کو سنا دیے جائیں۔ سن ۹ ہجری کے اس حج میں مشرکین مکہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ وہاں حج کے اجتماع میں حضرت علی ؓ نے یہ آیات پڑھ کر سنائیں‘ جن کے تحت مشرکین کے ساتھ ہر قسم کے معاہدے سے اعلانِ براءت کر دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ مشرکینِ عرب کے لیے چار ماہ کی مہلت کا اعلان کیا گیا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ایمان لانا چاہیں تو لے آئیں‘ ورنہ اُن کا قتل عام ہوگا۔

یہ آیات چونکہ قرآن کریم کی سخت ترین آیات ہیں‘ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ احکامات دراصل اس عذابِ استیصال کے قائم مقام ہیں جو قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالحؑ‘ قومِ شعیبؑ‘ قومِ لوطؑ اور آلِ فرعون پر آیا تھا۔ ان تمام قوموں پر عذابِ استیصال اللہ کے اس اٹل قانون کے تحت آیا تھا جس کا ذکر قبل ازیں بھی ہو چکا ہے۔ اس قانون کے تحت مشرکینِ مکہ اب عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے‘ اس لیے کہ حضور ﷺ نے انہی کی زبان میں اللہ کے احکامات ان تک پہنچا کر اُن پر حجت تمام کر دی تھی۔ اس سلسلے میں اللہ کی مشیت کے مطابق ان کو جو مہلت دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ان پر عذابِ استیصال کی پہلی قسط میدانِ بدر میں نازل کی گئی اور دوسری اور آخری قسط کے طور پر اب انہیں الٹی میٹم دے دیا گیا کہ تمہارے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے صرف چار ماہ ہیں۔ اس مدت میں ایمان لانا چاہو تو لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس حکم کے اندر اُن کے لیے یہ آپشن خود بخود موجود تھا کہ وہ چاہیں تو جزیرہ نمائے عرب سے باہر بھی جا سکتے ہیں‘ مگر اب اس خطہ کے اندر وہ بحیثیتِ مشرک کے نہیں رہ سکتے‘ کیونکہ اب جزیرہ نمائے عرب کو شرک سے بالکل پاک کر دینے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت خصوصی کی تکمیلی شان کے ظہور کا وقت آن پہنچا تھا۔

ایک اشکال کی وضاحت: یہاں ایک اشکال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ آیات کی موجودہ ترتیب خطبات کی زمانی ترتیب کے بالکل برعکس ہے۔ جو خطبہ پہلے (۸ ہجری میں) نازل ہوا ہے وہ سورت میں دوسرے رکوع سے شروع ہو رہا ہے' جبکہ بعد (۹ ہجری) میں نازل ہونے والی آیات کو مقدم کر کے اِن سے سورت کا آغاز کیا گیا ہے۔ پھر یہ دوسرا خطبہ بھی آیات کی ترتیب کے باعث دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اس کی ابتدائی چھ آیات پہلے رکوع میں آ گئی ہیں' جبکہ بقیہ آیات چوتھے اور پانچویں رکوع میں ہیں۔ دراصل ترتیب آیات میں اس پیچیدگی کی وجہ قرآن کا وہ خاص اسلوب ہے جس کے تحت کسی انتہائی اہم بات کو موضوع کی منطقی اور روایتی ترتیب میں سے نکال کر شہ سرخی (head line) کے طور پر پہلے بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس اسلوب کو سمجھنے کے لیے سورۃ الانفال کے آغاز کا انداز ذہن میں رکھیے۔ وہاں مالِ غنیمت کا مسئلہ انتہائی اہم اور حساس نوعیت کا تھا' جس پر تفصیلی بحث تو بعد میں ہونا مقصود تھی' لیکن اس ضمن میں بنیادی اصول سورت کی پہلی آیت میں بیان کر دیا گیا اور مسئلے کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع سے سورت کا آغاز فرمایا گیا۔ بالکل اسی انداز میں اس سورت کا آغاز بھی ایک انتہائی اہم مسئلے کے بیان سے کیا گیا' البتہ اس مسئلے کی بقیہ تفصیل بعد میں چوتھے اور پانچویں رکوع میں بیان ہوئی۔

حصہ دوم: اس سورت کا دوسرا حصہ چھٹے رکوع سے لے کر آخر تک گیارہ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کا تعلق حضور ﷺ کی بعثت عمومی سے ہے۔ اس لیے کہ اس حصے کا مرکزی موضوع غزوۂ تبوک ہے اور غزوۂ تبوک تمہید تھی' اس جدوجہد کی جس کا آغاز اقامتِ دین کے سلسلے میں جزیرہ نمائے عرب سے باہر بین الاقوامی سطح پر ہونے والا تھا۔ اِن گیارہ رکوعوں میں سے ابتدائی چار رکوع تو وہ ہیں جو غزوۂ تبوک کے لیے مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کرنے سے متعلق ہیں' چند آیات وہ ہیں جو تبوک جاتے ہوئے دورانِ سفر نازل ہوئیں' چند آیات تبوک میں قیام کے دوران اور چند تبوک سے واپسی پر راستے میں نازل ہوئیں' جبکہ ان میں چند آیات ایسی بھی ہیں جو تبوک سے واپسی کے بعد نازل ہوئیں۔

آیات ۱ تا ۶

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱ فَسِيْحُوْا
فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ

مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ
اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْۗءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ڏ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ
وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ
شَيْـــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ
حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ
فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝۵ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ
اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

آیت ۱ ﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ①﴾ ''اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان لوگوں کی جانب جن سے (اے مسلمانو!) تم نے معاہدے کیے تھے مشرکین میں سے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے تمام معاہدے ختم کرنے کا دوٹوک الفاظ میں اعلان ہے جو مسلمانوں نے مشرکین کے ساتھ کر رکھے تھے۔ یہ اعلان چونکہ انتہائی اہم اور حساس نوعیت کا تھا اور قطعی (categorical) انداز میں کیا گیا تھا' اس لیے اس کے ساتھ کچھ شرائط یا استثنائی شقوں کا ذکر بھی کیا گیا جن کی تفصیل آئندہ آیات میں آئے گی۔ سورۃ التوبہ کے ضمن میں ایک اور بات لائق توجہ ہے کہ یہ قرآن کی واحد سورت ہے جس کے آغاز میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھی جاتی۔ اس کا سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ سورت تو ننگی تلوار لے کر یعنی مشرکین کے لیے قتل عام کا اعلان لے کر نازل ہوئی ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت کی صفات کے ساتھ اس کے مضامین کی مناسبت نہیں ہے۔

آیت ۲ ﴿فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ ''تو گھوم پھر لو اس زمین میں چار ماہ تک''

یعنی اس جزیرہ نمائے عرب میں تمہیں رہنے اور گھومنے پھرنے کے لیے صرف چار مہینے کی مہلت دی جا رہی ہے۔

﴿وَّاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ‌ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخۡزِى الۡـكٰفِرِيۡنَ ﴿۲﴾﴾ ''اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ بھی کہ اللہ کافروں کو رسوا کر کے رہے گا۔''

اب ان مشرکین کے لیے اللہ کے عذاب کی آخری قسط آ کر رہے گی۔ یہ قطعی اعلان تو ایسے معاہدوں کے ضمن میں تھا جن میں کوئی میعاد معین نہیں تھی' جیسے عام دوستی کے معاہدے' جنگ نہ کرنے کے معاہدے وغیرہ۔ ایسے تمام معاہدوں کو چار ماہ کی پیشگی وارننگ کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ یہ ایک معقول طریقہ تھا جو سورۃ الانفال کی آیت ۵۸ میں بیان کردہ اصول ﴿فَانۡۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ ؕ﴾ کے مطابق اختیار کیا گیا۔ یعنی معاہدے کو علی الاعلان دوسرے فریق کی طرف پھینک دیا گیا' اور پھر فوراً اقدام بھی نہیں کیا گیا' بلکہ چار ماہ کی مہلت بھی دے دی گئی۔

آیت ۳ ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ﴾ ''اور اعلانِ عام ہے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے لوگوں کے لیے حج اکبر کے دن''

عمرے کو چونکہ ''حج اصغر'' کہا جاتا ہے اس لیے یہاں عمرے کے مقابلے میں حج کو ''حج اکبر'' کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں عوام میں جو یہ بات مشہور ہے کہ حج اگر جمعہ کے دن ہو تو وہ حج اکبر ہوتا ہے' ایک بے بنیاد بات ہے۔

﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِىۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ وَرَسُوۡلُهٗ ؕ﴾ ''کہ اللہ بری ہے مشرکین سے اور اس کا رسول ﷺ بھی۔''

یہ اعلان چونکہ حج کے اجتماع میں کیا گیا تھا اور حج کے لیے جزیرہ نمائے عرب کے تمام اطراف و اکناف سے لوگ آئے ہوئے تھے' لہٰذا اس موقع پر اعلان کرنے سے گویا عرب کے تمام لوگوں کے لیے اعلان عام ہو گیا کہ اب اللہ اور اس کا رسول ﷺ مشرکین سے بری الذمہ ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی معاہدہ نہیں رہا۔

﴿فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ۚ﴾ ''تو اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔''

﴿وَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ‌ ؕ﴾ ''اور اگر تم روگردانی کرو گے تو سن رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔''

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۳﴾﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دے دیجیے ان کافروں کو دردناک عذاب کی۔''

آیت ۴ ﴿اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدْتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴾ ''سوائے اُن مشرکین کے جن سے (اے مسلمانو!) تم نے معاہدے کیے تھے''

﴿ثُمَّ لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ شَيۡـــًٔا وَّلَمۡ يُظَاهِرُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَحَدًا﴾ ''پھر انہوں نے کچھ کمی نہیں کی تمہارے ساتھ' اور نہ تمہارے خلاف مدد کی کسی کی بھی''

یہاں میعادی معاہدوں کے سلسلے میں استثناء کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یعنی مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے ایسے معاہدے جو کسی خاص مدت تک ہوئے تھے' ان کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر یہ مشرکین تمہارے ساتھ کیے گئے کسی معاہدے کو بخوبی نبھا رہے ہیں اور تمام شرائط کی پابندی کر رہے ہیں:

﴿فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ‌ ؕ﴾ ''تو مکمل کرو اُن کے ساتھ اُن کا معاہدہ مقررہ مدت تک۔''

یعنی مشرکین کے ساتھ ایک خاص مدت تک تمہارا کوئی معاہدہ ہوا تھا اور ان کی طرف سے ابھی تک اس میں کسی قسم کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوئی' تو اس معاہدے کی جو بھی مدت ہے وہ پوری کرو۔ اس کے بعد اس معاہدے کی تجدید نہیں ہو گی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

آیت ۵ ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ﴾ ''پھر جب یہ محترم مہینے گزر جائیں''

یہاں محترم مہینوں سے مراد وہ چار مہینے ہیں جن کی مشرکین کو مہلت دی گئی تھی۔ چار مہینے کی یہ مہلت یا امان غیر میعادی معاہدوں کے لیے تھی' جبکہ میعادی معاہدوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ اُن کی طے شدہ مدت تک پابندی کی جائے۔ لہٰذا جیسے جیسے کسی گروہ کی مدتِ امان ختم ہوتی جائے گی اس لحاظ سے اس کے خلاف اقدام کیا جائے گا۔ بہرحال جب یہ مہلت اور امان کی مدت گزر جائے:

﴿فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدْتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا

﴿لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ﴾ ''تو قتل کرو ان مشرکین کو جہاں پاؤ' اور پکڑو ان کو' اور گھیراؤ کرو ان کا' اور ان کے لیے ہر جگہ گھات لگا کر بیٹھو۔''

ان الفاظ میں موجود سختی کو محسوس کرتے ہوئے اُس منظر اور ماحول کو ذہن میں لایئے جب یہ آیات بطور اعلانِ عام پڑھ کر سنائی جا رہی تھیں اور اندازہ کیجیے کہ ان میں سے ایک ایک لفظ اس ماحول میں کس قدر اہم اور پر تاثیر ہوگا۔ اس اجتماع میں مشرکین بھی موجود تھے اور ان کے لیے یہ اعلان اور الٹی میٹم یقیناً بہت بڑی ذلت و رسوائی کا باعث تھا۔

جب یہ چھ آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی ؓ کو قافلہ حج کے پیچھے روانہ کیا اور انہیں تاکید کی کہ حج کے اجتماع میں میرے نمائندے کی حیثیت سے یہ آیات بطورِ اعلانِ عام پڑھ کر سنا دیں۔ اس لیے کہ عرب کے رواج کے مطابق کسی بڑی شخصیت کی طرف سے اگر کوئی اہم اعلان کرنا مقصود ہوتا تو اس شخصیت کا کوئی قریبی عزیز ہی ایسا اعلان کرتا تھا۔ جب حضرت علی ؓ قافلہ حج سے جا کر ملے تو قافلہ پڑاؤ پر تھا۔ امیر قافلہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ تھے۔ جونہی حضرت علیؓ آپؓ سے ملے تو آپؓ نے پہلا سوال کیا: اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟ یعنی آپؓ امیر بنا کر بھیجے گئے ہیں یا مامور؟ مراد یہ تھی کہ پہلے میری اور آپؓ کی حیثیت کا تعین کر لیا جائے۔ اگر آپؓ کو امیر بنا کر بھیجا گیا ہے تو میں آپؓ کے لیے اپنی جگہ خالی کر دوں اور خود آپؓ کے سامنے مامور کی حیثیت سے بیٹھوں۔ اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں مامور ہوں' امیر حج آپؓ ہی ہیں' البتہ حج کے اجتماع میں آیاتِ الٰہی پر مشتمل اہم اعلان رسول اللہ ﷺ کی طرف سے میں کروں گا۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کی تربیت بہت خوبصورت انداز میں فرمائی تھی اور آپ ﷺ کی اسی تربیت کے باعث اُنؓ کی جماعتی زندگی انتہائی منظم تھی۔ اور آج مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ یہ دنیا کی انتہائی غیر منظم قوم بن کر رہ گئے ہیں۔

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵﴾ ''پھر اگر وہ توبہ کر لیں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

یعنی اگر وہ شرک سے تائب ہو کر مسلمان ہو جائیں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دینا قبول

کر لیں تو پھر ان سے مواخذہ نہیں۔

آیت ۶ ﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ ''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپؐ سے پناہ طلب کرے' تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے''

جزیرہ نمائے عرب میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے ابھی تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو سنجیدگی سے سنا ہی نہیں ہوگا۔ اتنے بڑے الٹی میٹم کے بعد ممکن ہے اُن میں سے کچھ لوگ سوچنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ اس دعوت کو سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ اسی حوالے سے حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر کوئی شخص تم لوگوں سے پناہ طلب کرے تو نہ صرف اسے پناہ دے دی جائے' بلکہ اسے موقع بھی فراہم کیا جائے کہ وہ قرآن کے پیغام کو اچھی طرح سن لے۔ یہاں ''کلام اللہ'' کے الفاظِ قرآنی گویا شہادت دے رہے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

﴿ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ﴾ ''پھر اُسے اُس کی امن کی جگہ پر پہنچا دو۔''

یعنی ایسے شخص کو فوری طور پر فیصلہ کرنے پر مجبور نہ کیا جائے کہ اسلام قبول کرتے ہو یا نہیں؟ اگر قبول نہیں کرتے تو ابھی تمہاری گردن اڑا دی جائے گی' بلکہ کلام اللہ سننے کا موقع فراہم کرنے کے بعد اسے سمجھنے اور سوچنے کے لیے مہلت دی جائے اور اسے بحفاظت اس کے گھر تک پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶﴾ ''یہ اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے۔''

یعنی یہ لوگ ابھی تک بھی غفلت کا شکار ہیں۔ انہوں نے ابھی تک سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں کہ یہ دعوت ہے کیا!

جس مضمون سے سورت کی ابتدا ہوئی تھی وہ یہاں عارضی طور پر ختم ہو رہا ہے' اب دوبارہ اس مضمون کا سلسلہ چوتھے رکوع کے ساتھ جا کر ملے گا۔ اس کے بعد اب دو رکوع (دوسرا اور تیسرا) وہ آئیں گے جو فتح مکہ سے قبل نازل ہوئے اور ان میں مسلمانوں کو قریشِ مکہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔

آیات ۷ تا ۱۶

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧﴾ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ
يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩﴾ لَا
يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿١٠﴾ فَاِنْ تَابُوْا
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١١﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿١٢﴾ اَلَا
تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣﴾
قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ
صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ
يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٥﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ
وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

فتح مکہ سے قبل صورتِ حال ایسی تھی کہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں بہت سے لوگ تذبذب اور الجھن کا شکار تھے۔ بعض مسلمانوں کے بیوی بچے اور بہت سے کمزور مسلمان جو ہجرت نہیں کر پائے تھے‘ ابھی تک مکہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ اکثر لوگوں کو خدشہ تھا کہ اگر مکہ پر حملہ ہوا تو بہت خون خرابہ ہوگا اور مکہ میں موجود تمام مسلمان اس کی زد میں آ جائیں گے۔ اگرچہ

بعد میں بالفعل جنگ کی نوبت نہ آئی مگر مختلف ذہنوں میں ایسے اندیشے بہرحال موجود تھے۔ اس سلسلے میں زیادہ بے چینی منافقین نے پھیلائی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان آیات میں مسلمانوں کو مکہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔

آیت ۷ ﴿كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ﴾ ”کیسے ہو سکتا ہے مشرکین کے لیے کوئی عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک؟“

یہاں پر اُس پس منظر کو ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے جس میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس سے قبل مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ ہو چکی تھی‘ لیکن اس معاہدے کو خود قریش کے ایک قبیلے نے توڑ دیا۔ بعد میں جب قریش کو اپنی غلطی اور معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے سردار ابوسفیان کو تجدیدِ صلح کی درخواست کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ مدینہ پہنچ کر ابوسفیان سفارش کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اپنی بیٹی حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا (اُمّ المؤمنین) سے ملے۔ اِن دونوں شخصیات کی طرف سے اُن کی سرے سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ بلکہ حضرت اُمِّ حبیبہؓ کے ہاں تو ابوسفیان کو عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ جب اپنی بیٹی کے ہاں گئے تو حضور ﷺ کا بستر بچھا ہوا تھا‘ وہ بستر پر بیٹھنے لگے تو اُمِّ حبیبہؓ نے فرمایا کہ ابا جان ذرا ٹھہریے! اس پر وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ بیٹی نے بستر تہ کر دیا اور فرمایا کہ ہاں ابا جان اب بیٹھ جایئے۔ ابوسفیان کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی‘ وہ قریش کے سب سے بڑے سردار اور رئیس تھے اور بستر تہ کرنے والی ان کی اپنی بیٹی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پوچھا: بیٹی! کیا یہ بستر میرے لائق نہیں تھا یا میں اس بستر کے لائق نہیں؟ بیٹی نے جواب دیا: ابا جان! آپ اس بستر کے لائق نہیں۔ یہ اللہ کے نبی ﷺ کا بستر ہے اور آپ مشرک ہیں! چنانچہ ابوسفیان اب کہیں تو کیا کہیں! وہ تو آئے تھے بیٹی سے سفارش کروانے کے لیے اور یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹ ہو گیا۔ چنانچہ مطلب کی بات کے لیے تو زبان بھی نہ کھل سکی ہو گی۔

بہرحال ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ سے مل کر تجدیدِ صلح کی درخواست کی مگر حضور ﷺ نے قبول نہیں فرمائی۔ اِن حالات میں ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے چہ می گوئیاں کی ہوں کہ دیکھیں جی قریش کا سردار خود چل کر آیا تھا‘ صلح کی بھیک مانگ رہا تھا‘ صلح بہتر ہوتی ہے‘ حضور ﷺ کیوں صلح نہیں کر رہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس پس منظر میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس

کے رسول ﷺ کے نزدیک ان مشرکین کے لیے اب کوئی معاہدہ کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ یعنی ان کے کسی عہد کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر کس طرح باقی رہ سکتی ہے؟

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ﴾ ’’سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا مسجدِ حرام کے پاس۔‘‘

اس معاہدے سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔

﴿فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ⑦﴾ ’’تو جب تک وہ تمہارے لیے (اس پر) قائم رہیں تم بھی ان کے لیے (معاہدے پر) قائم رہو۔ بے شک اللہ متقین کو پسند کرتا ہے۔‘‘

یعنی جب تک مشرکین صلح کے اس معاہدے پر قائم رہے، تم لوگوں نے بھی اس کی پوری پوری پابندی کی، مگر اب جب کہ وہ خود ہی اسے توڑ چکے ہیں تو اب تمہارے اوپر اس سلسلے میں کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ہے کہ لازماً اس معاہدے کی تجدید کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ اب ان مشرکین میں اتنا دم نہیں ہے کہ وہ مقابلہ کر سکیں۔ ان حالات میں معاہدے کی تجدید کا مطلب تو یہ تھا کہ کفر اور شرک کو اپنی مذموم سرگرمیوں کے لیے پھر سے کھلی چھٹی (fresh lease of existance) مل جائے۔ اس لیے حضور ﷺ نے معاہدے کی تجدید قبول نہیں فرمائی۔

آیت ۸ ﴿كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ﴾ ’’کیسے (کوئی معاہدہ قائم رہ سکتا ہے ان سے!) جبکہ اگر وہ تم پر غالب آ جائیں تو ہرگز لحاظ نہیں کریں گے تمہارے بارے میں کسی قرابت کا اور نہ عہد کا۔‘‘

ایسے لوگوں سے آخر کوئی معاہدہ کیوں کر قائم رہ سکتا ہے جن کا کردار یہ ہو کہ اگر وہ تم پر غلبہ حاصل کر لیں تو پھر نہ قرابت داری کا لحاظ کریں اور نہ معاہدے کے تقدس کا پاس۔

﴿يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ ’’راضی کرنا چاہتے ہیں تم لوگوں کو اپنے منہ (کی باتوں) سے‘‘

اب وہ صلح کی تجدید کی خاطر آئے ہیں تو اس کے لیے بظاہر خوشامد اور چاپلوسی کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح آپ لوگوں کو راضی کر لیں۔

﴿وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ⑧﴾ ’’جبکہ ان کے دل (اب بھی)

انکاری ہیں، اور ان کی اکثریت فاسقین پر مشتمل ہے۔‘‘

جو باتیں وہ زبان سے کر رہے ہیں وہ اُن کے دل کی آواز نہیں ہے۔ دل سے وہ ابھی بھی نیک نیتی کے ساتھ صلح پر آمادہ نہیں ہیں۔

آیت ۹ ﴿اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ ’’انہوں نے اللہ کی آیات کو فروخت کیا حقیر سی قیمت کے عوض‘‘

انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کی قدر نہیں کی اور ان کے بدلے میں حقیر سا دُنیوی فائدہ حاصل کر لیا۔ انہوں نے محمد ﷺ کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے اور حق کو پہچانتے ہوئے صرف اس لیے رد کر دیا ہے کہ ان کی چودھراہٹیں قائم رہیں، لیکن انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے بہت گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑨﴾ ’’پس وہ لوگوں کو روکتے رہے اللہ کے رستے سے (اور خود بھی رُکتے رہے) یقیناً بہت ہی برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔‘‘

صَدَّ يَصُدُّ صَدًّا، اس فعل کے اندر رکنے اور روکنے، دونوں کے معنی پائے جاتے ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ﴾ ’’نہیں لحاظ کرتے کسی مؤمن کے حق میں نہ کسی قرابت کا اور نہ کسی معاہدے کا۔‘‘

﴿وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ⑩﴾ ’’اور یہی لوگ ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ﴾ ’’پھر بھی اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔‘‘

اللہ نے ان کے لیے اب بھی توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہوا ہے۔ اب بھی اگر وہ اسلام قبول کر لیں اور شعارِ دینی کو اپنا لیں تو وہ تمہاری دینی برادری میں شامل ہو سکتے ہیں۔

﴿وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑪﴾ ’’اور ہم اپنی آیات کی تفصیل بیان کر رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ ’’اور اگر وہ

توڑ ڈالیں اپنے قول و قرار کو عہد کرنے کے بعد اور عیب لگائیں تمہارے دین میں‘‘

﴿فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ﴾ ’’تو تم جنگ کرو کفر کے ان اماموں سے‘ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں‘‘

یہ بہت اہم اور قابل توجہ نکتہ ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کے اندر کافر اور مشرک تو بہت تھے مگر یہاں خصوصی طور پر کفر اور شرک کے پیشواؤں سے جنگ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ ’’ائمّة الکفر‘‘ (کفر کے امام) قریش تھے۔ وہ کعبہ کے متولی اور تمام قبائل کے بتوں کے مجاور تھے۔ دوسری طرف سیاسی‘ معاشرتی اور معاشی لحاظ سے مکہ کو ’’اُمّ القریٰ‘‘ کی حیثیت حاصل تھی اور وہ ان کے زیر تسلط تھا۔ اُس وقت اگرچہ جزیرہ نمائے عرب میں نہ کوئی مرکزی حکومت تھی اور نہ ہی کوئی باقاعدہ مرکزی دارالحکومت تھا‘ مگر پھر بھی اس پورے خطے کا مرکزی شہر اور معنوی صدر مقام مکہ ہی تھا‘ اور اس مرکزی شہر اور اُمّ القریٰ میں واقع اللہ کے گھر کو قریش نے شرک کا اڈا بنایا ہوا تھا۔ اس لیے جب تک ان کو شکست دے کر مکہ کو کفر اور شرک سے پاک نہ کر دیا جاتا‘ جزیرہ نمائے عرب کے اندر دین کے غلبے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے یہاں ﴿فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ﴾ کا واضح حکم دیا گیا ہے‘ کہ جب تک کفر کے ان سرغنوں کا سر نہیں کچلا جائے گا اور شرک کے اس مرکزی اڈے کو ختم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک سرزمین عرب میں دین کے کلی غلبے کی راہ ہموار نہیں ہوگی۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿١٢﴾﴾ ’’شاید کہ (اس طرح) وہ باز آجائیں۔‘‘

یعنی ان پر سختی کی جائے گی تو شاید باز آجائیں گے‘ نرمی سے یہ ماننے والے نہیں ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ﴾ ’’تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرنا چاہتے ایسی قوم سے جنہوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیے اور رسولؐ کو جلاوطن کرنے کا قصد کیا‘‘

اے مسلمانو! مشرکینِ مکہ نے صلح حدیبیہ کو خود توڑا ہے‘ جبکہ تمہاری طرف سے اس معاہدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی تھی‘ اور یہ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو مکہ سے جلاوطنی پر مجبور کیا تھا۔ تو آخر کیا وجہ ہے کہ اب جب ان سے جنگ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ تذبذب کا شکار ہو رہے ہیں۔

﴿وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ﴾ ’’اور انہوں نے ہی آغاز کیا تھا تمہارے ساتھ پہلی مرتبہ۔‘‘

یعنی مکہ کے اندر مسلمانوں کو ستانے اور تکلیفیں پہنچانے کی کارستانیاں ہوں یا غزوۂ بدر میں جنگ چھیڑنے کا معاملہ ہو یا صلح حدیبیہ کے توڑنے کا واقعہ‘ تمہارے ساتھ ہر زیادتی اور بے اصولی کی پہل ہمیشہ ان لوگوں ہی کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔

﴿اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ﴾ ’’کیا تم ان سے ڈر رہے ہو؟‘‘

یہ متجسّسانہ سوال (searching question) کا انداز ہے کہ ذرا اپنے گریبانوں میں جھانکو‘ اپنے دلوں کو ٹٹولو‘ کیا واقعی تم ان سے ڈر رہے ہو؟ کیا تم پر کوئی بزدلی طاری ہو گئی ہے؟ آخر تم قریش کے خلاف اقدام سے کیوں گھبرا رہے ہو؟

﴿فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣﴾﴾ ’’اللہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔‘‘

اب اس کے بعد اقدام کرنے کا آخری حکم قطعی انداز میں دیا جا رہا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٤﴾﴾ ’’تم ان سے جنگ کرو‘ اللہ انہیں عذاب دے گا تمہارے ہاتھوں‘ اور ان کو رسوا کرے گا‘ اور تمہاری مدد کرے گا ان کے مقابلے میں اور بہت سے اہلِ ایمان کے سینوں کو ٹھنڈک عطا فرمائے گا۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ﴾ ’’اور ان کے دلوں کے غصہ کو نکال دے گا۔‘‘

اللہ تعالیٰ اس اقدام کے نتائج کے طور پر مسلمانوں کے سینوں کی جلن کو دور کرے گا اور انہیں ٹھنڈک عطا فرمائے گا۔ مکہ میں ابھی بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کو قریش کی طرف سے تکالیف پہنچائی جا رہی تھیں۔ ابھی بھی مسلمان بچوں‘ عورتوں اور ضعیفوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ چنانچہ جب تمہارے حملے کے نتیجے میں ان ظالموں کی درگت بنے گی تو مظلوم مسلمانوں کے سینوں کی جلن بھی کچھ کم ہو گی۔

﴿وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٥﴾﴾ ’’اور اللہ جس کو چاہے گا توبہ کی توفیق دے گا۔ اور اللہ جاننے والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘

اب جو آیت ''اَمۡ حَسِبۡتُمۡ'' کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے وہ اپنے خاص انداز اور لہجے کے ساتھ قرآن میں تین مرتبہ آئی ہے۔ دو مرتبہ اس سے پہلے اور تیسری مرتبہ یہاں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا: ﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ﴾ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴۲ میں فرمایا: ﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ﴾ اور یہاں (اس سورت کی آیت ۱۶ میں) فرمایا: ﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَکُوۡا وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ﴾

ایک ہی موضوع کی حامل ان تینوں آیات کے نہ صرف الفاظ آپس میں ملتے ہیں' بلکہ ان میں ایک عجیب و غریب مشابہت یہ بھی ہے کہ ہر آیت کے نمبر کے ہندسوں کا حاصل جمع ۷ آتا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَکُوۡا وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ﴾ ''کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ تم یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے' حالانکہ ابھی تو اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جو جہاد کرنے والے ہیں''

دوسری قوموں کے خلاف برسرِ پیکار ہونا اور بات ہے' تمہیں اب اپنی قوم کے خلاف جہاد کرنے کے لیے جانا ہے۔ گویا اس حکم کے اندر نسبتاً سخت امتحان ہے۔ چنانچہ اللہ تمہارا یہ امتحان بھی لینا چاہتا ہے۔

﴿وَلَمۡ یَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلَا رَسُوۡلِہٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَلِیۡجَۃً ؕ﴾ ''اور جو نہیں رکھتے اللہ' اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کے علاوہ کسی کے ساتھ قلبی دوستی کا کوئی تعلق۔''

یہ دُنیوی رشتوں کے خوشنما بندھن جب تک ایمان کی تلوار سے کٹیں گے نہیں' اس وقت تک اللہ اور دین کے ساتھ تمہارا اخلاص کیسے ثابت ہو گا!

﴿وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیات ۱۷ تا ۲۴

مَا کَانَ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یَّعۡمُرُوۡا مَسٰجِدَ اللّٰہِ شٰہِدِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ بِالۡکُفۡرِ ؕ

اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ۚۖ وَفِی النَّارِ ہُمۡ خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ
اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمۡ
یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلۡتُمۡ
سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ
وَجٰہَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ
الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَہَاجَرُوۡا وَجٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِہِمۡ
وَاَنۡفُسِہِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۲۰﴾
یُبَشِّرُہُمۡ رَبُّہُمۡ بِرَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ وَرِضۡوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّہُمۡ فِیۡہَا نَعِیۡمٌ
مُّقِیۡمٌ ﴿ۙ۲۱﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۲﴾ یٰۤاَیُّہَا
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَکُمۡ وَاِخۡوَانَکُمۡ اَوۡلِیَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡکُفۡرَ
عَلَی الۡاِیۡمَانِ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾ قُلۡ اِنۡ
کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ وَاِخۡوَانُکُمۡ وَاَزۡوَاجُکُمۡ وَعَشِیۡرَتُکُمۡ وَاَمۡوَالُۨ
اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَتِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَمَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ
مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَجِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ
وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾

آیت ۱۷ ﴿مَا کَانَ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یَّعۡمُرُوۡا مَسٰجِدَ اللّٰہِ شٰہِدِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ بِالۡکُفۡرِ ؕ﴾ ''مشرکوں کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے۔''

یہ مساجد تو اللہ کے گھر ہیں' یہ کعبہ اللہ کا گھر اور توحید کا مرکز ہے' جبکہ قریش علی الاعلان کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اللہ کے گھر کے متولی بھی بنے بیٹھے ہیں۔ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ اللہ کے ان دشمنوں کا اس کی مساجد کے اوپر کوئی حق کیسے ہو سکتا ہے؟

﴿اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ۚۖ وَفِی النَّارِ ہُمۡ خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے ہیں' اور آگ ہی میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

بیت اللہ کی دیکھ بھال اور حاجیوں کی خدمت جیسے وہ اعمال جن پر مشرکینِ مکہ پھولے نہیں سماتے‘ ایمان کے بغیر اللہ کے نزدیک اُن کے اِن اعمال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اُن کے کفر کے سبب اللہ نے ان کے تمام اعمال ضائع کر دیے ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ لَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ﴾ ’’یقیناً اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو ایمان لائیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر‘ نماز قائم کریں‘ زکوٰۃ ادا کریں‘ اور نہ ڈریں کسی سے سوائے اللہ کے‘‘

﴿فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ’’تو امید ہے کہ یہی لوگ راہ یاب ہوں گے۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ جٰہَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کو آباد رکھنے کو برابر کر دیا ہے اُس شخص (کے اعمال) کے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخرت پر اور اس نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں؟‘‘

مشرکینِ مکہ اس بات پر بہت نازاں ہیں کہ انہوں نے بیت اللہ کو آباد رکھا ہوا ہے اور وہ حاجیوں کو پانی پلانے جیسا کارِ خیر سرانجام دیتے ہیں‘ تو کیا اُن کے یہ امور ایمان باللہ‘ ایمان بالآخرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہو جائیں گے؟

﴿لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ’’یہ برابر نہیں ہو سکتے اللہ کے نزدیک۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’وہ لوگ جو ایمان لائے‘ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ‘ ان کا بہت عظیم رتبہ ہے اللہ کے نزدیک۔‘‘

﴿وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اور وہی لوگ ہیں کامیاب ہونے والے۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿یُبَشِّرُہُمۡ رَبُّہُمۡ بِرَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ وَ رِضۡوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّہُمۡ فِیۡہَا نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ ﴿۲۱﴾﴾ ’’انہیں بشارت دیتا ہے ان کا رب اپنی رحمتِ خاص اور رضامندی کی اور ان باغات کی جن کے اندر ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہوں گی۔‘‘

آیت ۲۲ ﴿خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۲﴾﴾ ’’جن میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔ یقیناً اللہ ہی کے پاس ہے بہت بڑا اجر۔‘‘

اگلی دو آیات اپنے موضوع اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے‘ مکہ پر چڑھائی کے سلسلے میں بعض مسلمانوں میں تذبذب پایا جاتا تھا۔ اس کی ایک بہت ہی اہم وجہ یہ تھی کہ مشرکین مکہ میں سے اکثر کے ساتھ مہاجرین کی بہت قریبی عزیز داریاں تھیں۔ ابھی تک تو کچھ اُمید تھی کہ شاید وہ لوگ ایمان لے آئیں گے‘ مگر اب صاف نظر آ رہا تھا کہ مکہ پر چڑھائی کی صورت میں اپنے قریبی عزیزوں کے خلاف لڑنا ہو گا‘ اپنے بھائیوں‘ بیٹوں اور باپوں کے گلے کاٹنا ہوں گے۔ انسانی سطح پر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا‘ مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی مسلمانوں کا یہ مشکل ترین امتحان لینا بھی مقصود تھا۔ لہٰذا یہ آیات اس ضمن میں اللہ کی مرضی اور دینِ حق کا اصول بہت واضح اور دوٹوک الفاظ میں بیان کر رہی ہیں۔

آیت ۲۳ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَکُمۡ وَ اِخۡوَانَکُمۡ اَوۡلِیَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡکُفۡرَ عَلَی الۡاِیۡمَانِ ؕ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اپنے باپوں اور بھائیوں کو دلی دوست اور حمایتی مت بناؤ اگر انہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کیا ہے۔‘‘

اگر اب بھی تمہارے دلوں میں اپنے کافر اقرباء کے لیے محبت موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر ایمان کے ساتھ تمہارا رشتہ مضبوط نہیں ہے۔ اللہ‘ اس کے دین اور توحید کے لیے تمہارے جذبات میں غیرت و حمیت نہیں ہے۔

﴿وَ مَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ’’اور تم میں سے جو کوئی بھی ان کے ساتھ ولایت (دوستی) کا تعلق رکھیں گے تو ایسے لوگ (خود بھی) ظالم ٹھہریں گے۔‘‘

اب وہ آیت آ رہی ہے جو اس موضوع پر قرآن کریم کی اہم ترین آیت ہے۔

آیت ۲۴ ﴿قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ

﴿مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ‘ تمہارے بیٹے‘ تمہارے بھائی‘ تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘ تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں‘ اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے‘ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں‘ (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ‘ اس کے رسول اور اس کے رستے میں جہاد سے‘ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾ ’’اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

یہاں آٹھ چیزیں گنوا دی گئی ہیں کہ اگر ان آٹھ چیزوں کی محبتوں میں سے کسی ایک یا سب محبتوں کا جذبہ اللہ‘ اُس کے رسول اور اُس کے رستے میں جہاد کی محبتوں کے جذبے کے مقابلے میں زیادہ ہے تو پھر اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ بہت سخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا لہجہ اور انداز ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کرے۔ اس کے ایک پلڑے میں یہ آٹھ محبتیں ڈالے اور دوسرے میں اللہ‘ اس کے رسولؐ اور جہاد کی تین محبتیں ڈالے اور پھر اپنا جائزہ لے کہ میں کہاں کھڑا ہوں! چونکہ انسان خود اپنے نفس سے خوب واقف ہے ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾ (القیامہ) اس لیے اسے اپنے باطن کی صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے گی۔ بہرحال اس سلسلے میں ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تو اس کی ساری خواہشیں‘ محبتیں اور حقوق (بیوی‘ اولاد‘ نفس وغیرہ کے حقوق) ان تین محبتوں کے تابع ہیں تو اس کے معاملاتِ ایمان درست ہیں‘ لیکن اگر مذکورہ آٹھ چیزوں میں سے کسی ایک بھی چیز کی محبت کا گراف اوپر چلا گیا تو بس یوں سمجھیں کہ وہاں توحید ختم ہے اور شرک شروع! اسی فلسفہ کو علامہ اقبالؔ نے اپنے اس شعر میں اس طرح پیش کیا ہے:

یہ مال و دولت دنیا‘ یہ رشتہ و پیوند   بتانِ وہم و گماں‘ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه!

آیت زیر نظر میں جو آٹھ چیزیں گنوائی گئی ہیں ان میں پہلی پانچ ’’رشتہ و پیوند‘‘ کے زُمرے میں آتی ہیں جب کہ آخری تین ’’مال و دولت دنیا‘‘ کی مختلف شکلیں ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ان چیزوں کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہے‘ یہ ہمارے وہم اور توہّم کے بنائے

ہوئے بُت ہیں۔ جب تک لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی شمشیر سے اِن بُتوں کو توڑا نہیں جائے گا‘ بندۂ مومن کے نہاں خانۂ دل میں توحید کا علم بلند نہیں ہو گا۔

دوسرے اور تیسرے رکوع پر مشتمل وہ خطبہ جو رمضان ۸ ہجری سے قبل نازل ہوا تھا یہاں ختم ہوا۔ اب چوتھے رکوع کے آغاز سے سلسلۂ کلام پھر سے سورت کی ابتدائی چھ آیات کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔

آیات ۲۵ تا ۲۹

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ
وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝۲۵ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ
الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝۲۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ
الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۸ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ
دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ
صٰغِرُوْنَ ۝۲۹

آیت ۲۵ ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ﴾ ’’(اے مسلمانو!) اللہ نے تمہاری مدد کی ہے بہت سے مواقع پر اور (خاص طور پر) حنین کے دن‘‘

جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے‘ پہلے‘ چوتھے اور پانچویں رکوع پر مشتمل یہ خطبہ ذوالقعدہ ۹ ہجری میں نازل ہوا تھا‘ جبکہ اس سے پہلے غزوۂ حنین شوال ۸ ہجری میں وقوع پذیر ہو چکا تھا۔

﴿اِذۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ کَثۡرَتُکُمۡ﴾ ’’جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا‘‘

معاملہ یوں نہیں تھا کہ لشکر میں شامل تمام مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز اور فخر محسوس ہو رہا تھا۔ غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی‘ جو اس سے پہلے کبھی کسی غزوہ میں اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ ان میں سے دس ہزار مسلمان تو وہ تھے جو فتح مکہ کے وقت حضور ﷺ کے ہمراہ تھے‘ اور دو ہزار لوگ مکہ سے شامل ہوئے تھے۔ مکہ سے شامل ہونے والوں میں اکثریت ان نومسلموں کی تھی جو مکہ فتح ہو جانے کے بعد ایمان لائے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں کچھ مشرک بھی ہوں جو اب مسلمانوں کی رعایا ہونے کے باعث معاونین اور خادمین کی حیثیت سے لشکر میں شامل ہو گئے ہوں۔ مسلمانوں کی یہ لشکر کشی ہوازن اور ثقیف کے قبائل کے خلاف تھی جو طائف اور اس کے اردگرد کی شاداب وادیوں میں آباد تھے۔ مسلمان اس سے قبل بارہا قلیل تعداد اور معمولی اسلحہ سے کفار کی بڑی بڑی فوجوں کو شکست دے چکے تھے۔ چنانچہ بعض مسلمانوں کی زبان سے اپنی کثرت کے زعم میں یہ الفاظ نکل گئے کہ ’’آج مسلمانوں پر کون غالب آ سکتا ہے!‘‘ دوسری طرف ہوازن اور ثقیف کے قبائل نے پہلے سے اپنے تیرانداز دستے پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر تعینات کر رکھے تھے اور موزوں مقامات پر صف آرائی کر لی تھی۔ یہ لوگ بڑے ماہر تیرانداز تھے۔ مسلمانوں کا لشکر جب وادیٔ حنین میں پہنچا تو پہاڑیوں پر موجود تیراندازوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ لشکر نشیب میں تھا‘ تیر بلندی سے آ رہے تھے اور دونوں طرف سے آ رہے تھے۔ اس سے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور بارہ ہزار کا لشکر جرار تتر بتر ہو گیا۔ جب ہراول دستے سے لوگ اضطراری کیفیت میں پلٹ کر بھاگے تو ریلے کی صورت میں بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ دھکیلتے چلے گئے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف ۳۰ یا ۴۰ آدمی رہ گئے تھے۔ علامہ شبلیؒ نے ’’سیرت النبی ﷺ‘‘ میں یہی لکھا ہے کہ ۳۰‘ ۴۰ آدمی رہ گئے تھے‘ لیکن سید سلیمان ندویؒ نے بعد میں اپنے استاد کی رائے پر اختلافی نوٹ لکھا کہ تین سو یا چار سو آدمی آپ ﷺ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ لیکن بارہ ہزار کے لشکر میں سے تین یا چار سو آدمیوں کا رہ جانا بھی کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں حضور ﷺ اپنی سواری سے نیچے اتر آئے‘ آپ ﷺ نے علم خود اپنے ہاتھ میں لیا اور بآوازِ بلند رجز پڑھا: اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب اَنَا ابۡنُ عَبۡدِ الۡمُطَّلِب کہ میں نبی ہوں اس میں کوئی شک نہیں! (یعنی میں یقیناً نبی ہوں‘ چاہے یہ بارہ ہزار لوگ میرا ساتھ دیں تب بھی‘ اور

اگر کوئی بھی ساتھ نہ دے تب بھی)۔ اور میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں‘ یعنی میں عبدالمطلب کا پوتا میدانِ جنگ میں بنفسِ نفیس موجود ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو پکارا: اِلَیَّ یَا عِبَادَ اللّٰہِ! ’’اللہ کے بندو‘ میری طرف آؤ!‘‘ اس کے بعد آپ ﷺ نے قریب ہی موجود اپنے چچا حضرت عباس ؓ کو‘ جن کی آواز کافی بلند تھی‘ حکم دیا کہ انصار و مہاجرین کو پکاریں۔ انہوں نے بلند آواز سے پکارا: اصحابِ بدر کہاں ہو؟ اصحابِ شجرہ (بیعت رضوان والو) کہاں ہو؟ اس پر لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف پلٹنا شروع ہوئے اور لشکر پھر سے اکٹھا ہوا۔ اس کے بعد ایک بھرپور جنگ لڑنے کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ آیت زیرِ نظر کا اشارہ اس پورے واقعہ کی طرف ہے۔

﴿فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡکُمۡ شَیۡـًٔا وَّ ضَاقَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّیۡتُمۡ مُّدۡبِرِیۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ ’’تو وہ (کثرت) تمہارے کچھ کام نہ آ سکی اور زمین پوری فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی‘ پھر تم پیٹھ موڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡہَا﴾ ’’پھر اللہ نے نازل فرمائی اپنی (طرف سے) تسکین اپنے رسولؐ اور اہلِ ایمان پر اور (اُس وقت بھی) ایسے لشکر اُتارے جنہیں تم نے نہیں دیکھا‘‘

﴿وَ عَذَّبَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ ’’اور عذاب دیا کافروں کو۔ اور یقیناً کافروں کا بدلہ یہی ہے۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿ثُمَّ یَتُوۡبُ اللّٰہُ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۷﴾﴾ ’’پھر اس کے بعد (بھی) اللہ توبہ نصیب فرمائے گا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے گا۔ اور اللہ بخشنے والا‘ رحم کرنے والا ہے۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِکُوۡنَ نَجَسٌ فَلَا یَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ بَعۡدَ عَامِہِمۡ ہٰذَا ۚ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! یہ مشرکین یقیناً ناپاک ہیں‘ لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔‘‘

یعنی اس سال (۹ ہجری) کے حج میں تو مشرکین بھی شامل ہیں‘ مگر آئندہ کبھی کوئی مشرک حج کے لیے نہیں آ سکے گا اور نہ کسی مشرک کو بیت اللہ یا مسجدِ حرام کے قریب آنے کی اجازت ہوگی۔

﴿وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَیۡلَۃً﴾ ’’اور اگر تمہیں اندیشہ ہو فقر کا‘‘

﴿فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۸﴾﴾ ’’تو عنقریب اللہ تمہیں غنی کر دے گا اپنے فضل سے اگر وہ چاہے گا۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘

اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اس حکم کے بعد حاجیوں کی تعداد کم ہو جائے گی اور ان کے نذرانوں اور قربانیوں سے ہونے والی آمدنی میں بھی کمی آ جائے گی‘ تو اسے اللہ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ رکھنا چاہیے۔ عنقریب اس قدر دُنیوی دولت تم لوگوں کو ملے گی کہ تم سنبھال نہیں سکو گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد چند سالوں کے اندر اندر حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ سلطنتِ فارس اور سلطنتِ روما کی فتوحات کے بعد مالِ غنیمت کا گویا سیلاب اُمنڈ آیا اور اس قدر مال مسلمانوں کے لیے سنبھالنا واقعی مشکل ہو گیا۔ یہی صورتِ حال تھی جس کے بارے میں حضور ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا:

((فَوَاللّٰهِ لَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ، وَلٰكِنْ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا، وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ))(۱)

’’پس اللہ کی قسم (اے مسلمانو!) مجھے تم پر فقر و احتیاج کا کوئی اندیشہ نہیں ہے‘ بلکہ مجھے تم پر اس بات کا اندیشہ ہے کہ تم پر دنیا کشادہ کر دی جائے گی (تمہارے قدموں میں مال و دولت کے انبار لگ جائیں گے) جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کی گئی‘ پھر تم اس کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو گے جیسے کہ وہ لوگ کرتے رہے‘ پھر یہ تمہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی جیسے کہ اس نے ان لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَـقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ ’’جنگ کرو تم ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں‘ نہ یومِ آخرت پر اور نہ حرام ٹھہراتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو‘ اور نہ

(۱) صحيح البخاری‘ کتاب الجزية و کتاب المغازی و کتاب الرقاق‘ باب ما يحذر من زهرة الدنيا والتنافس فيها۔ وصحيح مسلم‘ کتاب الزهد والرقائق۔

قبول کرتے ہیں دینِ حق کی تابعداری کو‘ ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی تھی‘ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ پیش کریں اور چھوٹے (تابع) بن کر رہیں۔‘‘

اس آیت میں بھی دین کا بہت اہم فلسفہ بیان ہوا ہے۔ اس حکم میں مشرکین عرب اور نسلِ انسانی کے باقی لوگوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۵ کی رو سے مشرکینِ عرب کو جو مہلت یا امان دی گئی تھی اس مدت کے گزرنے کے بعد ان کے لیے تو کوئی اور راستہ (option) اس کے علاوہ نہیں تھا کہ یا وہ ایمان لے آئیں یا انہیں قتل کر دیا جائے گا‘ یا وہ جزیرہ نمائے عرب چھوڑ کر چلے جائیں۔ اُن کا معاملہ تو اس لیے خصوصی تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے رسول کی حیثیت سے اُن پر آخری درجہ میں اتمامِ حجت کر دیا تھا‘ اور آپ ﷺ کا انکار کر کے وہ لوگ عذابِ استیصال کے حق دار ہو چکے تھے۔ مگر یہود و نصاریٰ اور باقی پوری نوعِ انسانی کے لیے اس ضمن میں قانون مختلف ہے۔ جزیرہ نمائے عرب سے باہر کے لوگوں کے لیے اور قیامت تک تمام دنیا کے انسانوں کے لیے وہ چیلنج نہیں کہ ایمان لاؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ کیونکہ اس کے بعد اب حضور ﷺ بحیثیت رسولؐ معنوی طور پر تو موجود ہیں مگر بنفسِ نفیس موجود نہیں‘ کہ براہِ راست کوئی قوم آپ ﷺ کی دعوت کو رد کر کے عذابِ استیصال کی مستحق ہو جائے۔ چنانچہ باقی تمام نوعِ انسانی کے افراد کا معاملہ یہ ہے کہ ان سے قتال کیا جائے گا‘ یہاں تک کہ وہ دین کی بالادستی کو بحیثیت ایک نظام کے قبول کر لیں‘ مگر انفرادی طور پر کسی کو قبولِ اسلام کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ہر کوئی اپنے مذہب پر کاربند رہتے ہوئے اسلامی ریاست کے ایک شہری کے طور پر رہ سکتا ہے‘ مگر ایسی صورتِ حال میں غیر مسلموں کو جزیہ دینا ہوگا۔ اسی فلسفے کے تحت خلافتِ راشدہ کے دور میں کسی بھی ملک پر لشکر کشی کرنے سے پہلے تین شرائط پیش کی جاتی تھیں۔ پہلی یہ کہ ایمان لے آؤ‘ ایسی صورت میں تم ہمارے برابر کے شہری ہو گے۔ اگر یہ قبول نہ ہو تو اللہ کے دین کی بالادستی قبول کر کے اسلامی ریاست کے فرمانبردار شہری بن کر رہنا اور جزیہ دینا قبول کر لو۔ ایسی صورت میں تم لوگوں کو آزادی ہو گی کہ تم یہودی‘ عیسائی‘ مجوسی‘ ہندو وغیرہ جو چاہو بن کر رہو۔ لیکن اگر یہ بھی قابل قبول نہ ہو اور تم لوگ اس زمین پر باطل کا نظام قائم رکھنا چاہو تو پھر اس کا فیصلہ جنگ سے ہوگا۔

انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقتِ انسان

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ۳/اگست ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ ٔمسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰہُ نُطۡفَۃً فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَۃَ مُضۡغَۃً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ٭ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّکُمۡ بَعۡدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوۡنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ تُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۶﴾ (المؤمنون)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ ؓ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ :

((اِنَّ اَحَدَکُمْ یُجْمَعُ خَلْقُہٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً، ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ، ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ، ثُمَّ یُرْسَلُ اِلَیْہِ الْمَلَکُ فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ......))(۱)

’’ابوعبدالرحمٰن‘ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے‘ وہ کہتے ہیں: رسول اللہﷺ نے ہم سے بیان فرمایا اور وہ صادق اور مصدوق ہیں:

’’تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں‘ اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں‘ اور

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب احادیث الانبیاء‘ باب خلق آدم وذریتہ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب القدر‘ باب کیفیۃ خلق الآدمی فی بطن امہ و کتابۃ رزقہ وأجلہ۔

اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعدازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے‘ پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے......‘‘

معزز سامعین کرام!

میں نے آپ کے سامنے امام یحییٰ بن شرف الدین النّووی ؒ کی مشہور کتاب ’’اربعین‘‘ کی چوتھی حدیث کا ابتدائی حصہ پڑھا ہے۔ اس میں ایک نہایت اہم موضوع ’’حقیقت انسان‘‘ زیر بحث آیا ہے‘ جسے قرآن مجید کے فلسفے اور حکمت دین کے اعتبار سے ذروۃ السنام کہا جا سکتا ہے۔ یہ گویا tip of the iceberg ہے۔ چنانچہ اس موضوع کو قدرے تفصیل سے سمجھنے کے لیے ہم سورۃ المؤمنون کی چند آیات کا مطالعہ بھی کریں گے۔ حدیث کے اس حصے سے اس اہم موضوع ’’انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقت انسان‘‘ کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے‘ جبکہ ان آیات مبارکہ میں اس موضوع کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور انسان کے تخلیقی مراحل کا مرحلہ وار تذکرہ کیا گیا ہے۔

قرآنی علم جنین پر جدید ماہرین کا تحیّر

قرآن مجید میں رحم مادر میں انسانی جنین کے ارتقاء کا ذکر‘ کہیں تفصیل سے اور کہیں اجمالی انداز میں‘ بہت مرتبہ آیا ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کے سامنے عہد حاضر میں ’’علم جنین‘‘ (Embryology) کے چوٹی کے دو پروفیسرز کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ہیں یونیورسٹی آف ٹورنٹو‘ کینیڈا کے ڈاکٹر کیتھ ایل مور‘ جن کی علم جنین کے موضوع پر کئی تصانیف ہیں اور ان میں سے دو کتابیں اکثر یونیورسٹیوں میں نصابی کتب (text books) کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ دوسرے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے موجد ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز ہیں ــــــ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا معاملہ یہ ہے کہ کبھی عورت کی ٹیوبز بند ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اُس کے ہاں ولادت نہیں ہو سکتی اور بعض اوقات شوہر کا معاملہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر مردانگی کی قوت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ صاحبِ اولاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا راستہ نکالا گیا کہ شوہر کا نطفہ اور بیوی کی بیضہ دانی میں سے بیضہ لے کر‘ ان کی تخم ریزی (fertilization) ٹیسٹ ٹیوب میں

کرکے‘ پھر اسے رحم مادر میں plant کر دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے اولاد حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ ٹیسٹ ٹیوب بے بیز دنیا میں اب عام ہیں اور اس طریقے کا موجد پروفیسر رابرٹ ایڈورڈز ہے —— پروفیسر رابرٹ ایڈورڈز اور ڈاکٹر کیتھ ایل مور دونوں نے نہایت متحیّرانہ انداز میں گواہی دی ہے کہ چودہ سو برس قبل جب dissection اور جسم کو چیر پھاڑ کر دیکھنے کا کوئی رواج نہ تھا‘ طب ابھی بالکل ابتدائی stages میں تھی‘ خوردبین (microscope) بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی‘ اُس دَور میں علم الجنین کا جو صحیح اندازہ اور رحم مادر میں انسانی جنین کی درجہ بدرجہ پرورش کی جو نقشہ کشی قرآن نے کی ہے وہ حیران کن حد تک ان معلومات سے مطابقت رکھتی ہے جو خوردبین کی ایجاد کے بعد حال ہی میں انسان کے علم میں آئی ہیں۔ پھر اس پر انہوں نے سعودی عرب جا کر لیکچرز بھی دیے جن کی ویڈیوز آج بھی آپ کو مل سکتی ہیں۔

انسان کے تخلیقی مراحل: قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں دو سورتوں‘ سورۃ الحج اور سورۃ المؤمنون کا ایک جوڑا ہے جس میں خاص طور پر علم الجنین اور رحم مادر میں انسانی جنین کے ارتقائی مراحل کا تفصیل سے تذکرہ ہے۔

سورۃ الحج میں فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ (آیت ۵)

’’اے لوگو! اگر تمہیں (مرنے کے بعد) دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں کوئی شک ہے تو (ذرا اپنی تخلیق پر غور کرو کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے‘ پھر اس سے نطفہ بنا کر‘ پھر اس سے علقہ بنا کر‘ پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی‘ تاکہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں۔ پھر ہم جس کو

چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر تک رحم مادر میں ٹھہرائے رکھتے ہیں‘ پھر ہم تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں‘ پھر تم اپنی پوری قوت (جوانی) کو پہنچتے ہو‘ اور تم میں سے کچھ (قبل از پیری) مر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو (بڑھاپے کی) بدترین عمر کو بھی پہنچا دیے جاتے ہیں کہ (جہاں پہنچ کر) سب کچھ جاننے کے بعد وہ کچھ نہیں جانتے۔‘‘

اس آیت میں بڑھاپے کی عمر کو ’’اَرْذَلِ الْعُمُر‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جب وہ پھر سے بچہ بن جاتا ہے اور جو کچھ اس نے پوری زندگی سیکھا پڑھا ہوتا ہے وہ سب ختم ہو جاتا ہے‘ حتیٰ کہ اس کی یادداشت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اب سورۃ المؤمنون کی ان آیات کی طرف آتے ہیں جو میں نے خطاب کے شروع میں تلاوت کی تھیں۔ ان میں پہلی آیت ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾﴾ ’’ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے گارے کے کشید کردہ جوہر سے‘‘۔ سُلٰلَة کہتے ہیں کسی چیز کو کھینچ لینا۔ تلوار کو میان میں سے کھینچنے کے لیے بھی فعل سَلَّ یَسُلُّ استعمال ہوتا ہے۔ کسی چیز کا عرق نکالنے کا ایک نظام ہے کہ اس کو پانی میں ڈال کر‘ اس کے نیچے آگ جلا کر‘ اور ایک لمبے process سے گزار کر عرق کشید ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا کہ ’’ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے گارے کے کشید کردہ جوہر سے‘‘۔ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۱۳﴾﴾ ’’پھر اس کو ایک مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا‘‘۔ رحم مادر کی دیوار بڑی مضبوط ہوتی ہے اور وہ نطفہ اس کے اندر مضبوطی سے جما ہوا (embeded) ہوتا ہے۔ ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ ’’پھر ہم نے نطفے کو علقہ کی شکل دی‘‘۔ وہ نطفہ جب بڑھتا ہے تو رحم مادر کی دیوار سے ابھر کر‘ bulge out کر کے لٹکنے لگتا ہے‘ اس لیے اس حالت کو ’’عَلَقَة‘‘ یعنی لٹکی ہوئی چیز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ ’’پھر اسی علقہ کو ہم گوشت کا ایک لوتھڑا بنا دیتے ہیں‘‘ ﴿فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا﴾ ’’پھر اسی لوتھڑے کے اندر ہڈیاں بنا دیتے ہیں‘‘ ﴿فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ﴾ ’’پھر ہم ان ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں‘‘ ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ﴾ ’’پھر ہم اسے اٹھاتے ہیں ایک اور ہی تخلیق پر‘‘۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ

الْخَالِقِیْنَ ﴿۱۴﴾ ''پس بہت بابرکت ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

حدیث کی تشریح

اس آیت میں ''خَلْقًا اٰخَرَ'' کا ذکر آیا ہے۔ یہ خَلْقًا اٰخَرَ کیا ہے؟ اس کا جواب اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث میں آیا ہے۔ حدیث کے راوی حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جو کبارِ صحابہ اور فقہاءِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ ''ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بات بتائی اور (جان لو کہ جنہوں نے ہمیں بتایا) وہ صادق اور مصدوق ہیں''۔ یعنی وہ سچے ہیں اور ان کی صداقت پر اللہ گواہ ہے۔

اس روایت کے شروع میں ''وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ'' کے الفاظ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کیوں کہے؟ حالانکہ اور بھی متعدد روایات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہیں‘ لیکن کسی اور روایت میں تمہیداً یہ الفاظ نہیں آتے‘ تو پھر یہاں کیوں آئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت میں ایک ایسی بات سامنے آ رہی ہے جو اُس وقت تک انسان کی ذہنی سطح اور مادی معلومات کے اعتبار سے کچھ نا قابل فہم سی تھی۔ لہٰذا اس بات کو بیان کرنے سے پہلے خاص طور پر تاکید کے انداز میں کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو‘ یہ کہنے والے محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں‘ جو سچے ہیں اور اللہ نے ان کی صداقت کی تصدیق بھی کی ہے۔

حدیث کا متن ان الفاظ سے شروع ہو رہا ہے: ((اِنَّ اَحَدَکُمْ یُجْمَعُ خَلْقُہٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً)) ''تم میں سے ہر شخص کی تخلیق ہوتی ہے اس کی ماں کے رحم میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں'' ((ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ)) ''پھر اتنا ہی عرصہ وہ علقہ کی شکل میں ہوتا ہے'' ((ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ)) ''پھر اتنا ہی عرصہ (یعنی چالیس دن) وہ ایک لوتھڑے کی شکل میں ہوتا ہے''۔ جب یہ چالیس+چالیس+چالیس= ایک سو بیس دن یعنی چار ماہ مکمل ہو جاتے ہیں: ((ثُمَّ یُرْسَلُ اِلَیْہِ الْمَلَکُ)) ''پھر اُس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے'' ((فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ)) ''پس وہ اس میں روح پھونک دیتا ہے۔''

حقیقتِ انسان

اب یہاں غور کیجیے کہ چودہ سو سال پہلے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے یہ بات فرمائی اور اُس وقت اگر لوگوں نے ((فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ)) سے مراد یہ لیا کہ فرشتہ اس بے جان گوشت کے لوتھڑے (مُضْغَۃ) میں جان ڈال دیتا ہے‘ تو اُس دور کی علمی سطح کے اعتبار سے یہ بات قابل فہم ہے۔ لیکن سائنس کی ترقی اور خوردبین کی ایجاد کے بعد ہماری آج کی علمی سطح اتنی ہے کہ ہم خوردبین کے ذریعے باریک سے باریک جرثومہ بھی دیکھ رہے ہیں—— انسان کے آغاز سے متعلق سورۃ القیامۃ میں آیا: ﴿اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ﴿۳۷﴾﴾ ''کیا (ابتدا میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا؟''—آج ہمیں معلوم ہے کہ منی کی بوند جو باپ کی طرف سے آ رہی ہے‘ اس میں بے شمار جرثومے (spermetozoa) ہوتے ہیں اور یہ جرثومے مردہ نہیں بلکہ زندہ وجود ہیں۔ مائیکروسکوپ کے نیچے آپ خود دیکھ لیجیے وہ آپ کو بھرپور جوش وخروش کے ساتھ دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اسی طرح ماں کا بیضہ (ovum) جو fallopian tube سے ہو کر چلا آ رہا ہے وہ بھی مردہ تو نہیں ہے بلکہ زندہ خلیہ (living cell) ہے۔ اب مرد کے جرثومے اور عورت کے بیضہ کے ملاپ سے رحم مادر میں انسان کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ ق﴾ (الدھر:۲) ''ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا''—— مرد کا نطفہ اور عورت کا بیضہ مل کر جفتہ (zygote) بن گیا اور یہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہے‘ اس لیے کہ زندگی تو آغاز سے چلی آ رہی ہے۔ پھر یہ جفتہ بڑھ رہا ہے‘ نشوونما پا رہا ہے اور یہ نشوونما پانا ہی زندگی کا ایک ثبوت ہے۔ لہٰذا ((فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ)) کا مطلب زندگی یا جان ڈالنا نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ زندگی تو آغاز ہی سے موجود ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں ''روح'' سے مراد ''جان'' نہیں‘ کچھ اور ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جو بدقسمتی سے آج بہت سے قرآن پڑھنے والوں اور دین کا مطالعہ کرنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہاں ''روح'' سے کیا مراد ہے اور پھر اس سے ''حقیقتِ

انسان‘‘ سمجھ میں آئے گی جسے میں نے ابتدا میں قرآن مجید کے فلسفے اور حکمت دین کے اعتبار سے ذروۃ السنام سے تعبیر کیا تھا — اصل میں انسان ایک مرکب وجود ہے‘ اس میں ایک مکمل حیوان بھی ہے اور ایک فرشتہ یعنی ایک روحانی وجود بھی ہے۔ یہ بات بہت خوبصورت انداز میں شیخ سعدیؒ نے کہی تھی:

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

یعنی انسان کچھ چیزوں سے مل کر بنا ہے‘ اس مرکب میں فرشتہ بھی پیوست ہے اور حیوان بھی۔ انسان کے بارے میں یہ عظیم حقیقت ہے‘ جس کو اگر نہ سمجھا جائے تو حکمتِ قرآنی کے جو غامض اور عمیق پہلو ہیں وہ سمجھ میں نہیں آسکتے۔ انسان عقیدت اور اندھے یقین کی بنیاد پر ایسے مقامات سے گزر جائے گا‘ لیکن عقل (logic) کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہاں رکا جائے اور غور وفکر کا حق ادا کیا جائے۔

تخلیقِ کائنات کے مراحل

آج دنیا میں تخلیق کائنات (Creation of the Universe) کا جو تصور ہے اس میں یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک‘ بابائے طبعیات نیوٹن کے دور میں تخلیق کائنات کے حوالے سے یہ تصور تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی‘ مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور یہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد آئن سٹائن کے ذریعے دنیائے طبعیات میں انقلاب عظیم آیا اور آج محققین کا اس پر تقریباً اجماع ہے کہ اس کائنات کا ایک آغاز (beginning) ہے اور انہوں نے اس کو Big Bang کا نام دیا ہے۔ یعنی اربوں سال پہلے ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا اور پھر اس سے کائنات کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک اختتام (end) بھی ہے‘ جسے قرآن ’’اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی‘‘ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ کائنات ہمیشہ کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک خاص معینہ مدت تک رہے گی اور اس کے بعد اس کائنات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

Big Bang کے نتیجے میں حرارت کا وہ گولہ وجود میں آیا جو بہت چھوٹے ذرات پر مشتمل تھا‘ جن کا درجہ حرارت ناقابل تصور حد تک بلند تھا اور یہ ذرات ایک دوسرے سے دُور بھاگتے تھے۔ یہ اس مادی دنیا کی شروعات کا پہلا مرحلہ تھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان ذرات کی حرارت میں کمی آتی چلی گئی۔ پھر یہ ذرات تیزی سے حرکت کرتے ہوئے قریب آئے اور مختلف forms میں اکٹھے ہوئے تو کہکشائیں (galaxies) وجود میں آئیں۔ پھر یہ کہکشائیں ایک دوسرے سے دور بھاگتی رہیں۔ آج بھی یہ مانا جا رہا ہے کہ کائنات ابھی پھیل رہی ہے اور کہکشاؤں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ اس کی بڑی پیاری مثال دی جاتی ہے کہ اگر آپ ایک غبارے کے اوپر کچھ نقطے (dots) لگا دیں‘ اور پھر اس غبارے کو آپ جتنا پھلائیں گے‘ ان نقطوں (dots) کے مابین فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اسی طرح ان کہکشاؤں کے درمیان فاصلے بڑھنے سے کائنات میں وسعت ہو رہی ہے۔ نظریہ توسیع کائنات (Theory of the Expanding Universe) کے حوالے سے اقبال نے کہا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون!

قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے: ﴿يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ﴾ (فاطر:۱) ’’وہ اپنی تخلیق میں وسعت کردیتا ہے جس قدر چاہتا ہے۔‘‘

کہکشائیں بننے کے بعد پھر وہ دور آیا کہ جب ان کے اندر ستارے اور سیارے بنے۔ ان ستاروں میں ایک ستارہ ہمارا سورج بھی تھا‘ جس کے اندر مزید ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں اس کے سیارے وجود میں آئے۔ ان ہی سیاروں میں سے ایک سیارہ ہماری یہ زمین ہے۔ ابتدا میں یہ سورج کی طرح آگ کا کُرّہ تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈا ہوا اور ٹھنڈا ہونے سے یہ سکڑ گیا۔ اس کی وجہ سے اس پر نشیب وفراز پیدا ہوئے۔ پھر اس میں سے جو بخارات نکلے انہوں نے زمین کے غلاف ’’فضا‘‘ (atmosphere) کی شکل اختیار کی۔ پھر اس فضا میں موجود گیسز ہائیڈروجن اور آکسیجن کے باہمی ملاپ (interaction) سے

پانی وجود میں آیا اور یہ پانی ہزار ہا برس تک زمین پر برستا رہا‘ جس سے سمندر وجود میں آئے۔ زمین ٹھنڈی ہونے سے اس پر خاک کی ایک تہہ پیدا ہوگئی جسے ’’قشرِ ارض‘‘ (Crust of the Earth) کہا جاتا ہے۔ پھر اس خاک اور پانی کے امتزاج سے اس کرۂ ارضی پر حیات کا آغاز ہوا جو کروڑوں سال کے ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنے آخری نتیجہ کو پہنچی‘ جو آج کے نظریے کے مطابق موجودہ انسان (Homo sapiens) ہیں۔

یہ میں نے آج کا نظریہ تخلیق آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس میں پہلے حصوں کے بارے میں تو اب کوئی اختلاف نہیں ہے‘ البتہ نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) کے بارے میں اختلافات اب بھی ہیں۔ بہرحال یہ ایک نظریہ ہے۔ اگرچہ علم الحیات (Biology) کے میدان میں اس نظریہ ارتقاء کو من وعن قبول نہیں کیا گیا‘ لیکن اس کو ایک حقیقت کے اعتبار سے (as a matter of fact) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کی سوچ‘ سوشل سائنسز اور ہر چیز میں ارتقاء کا تصور موجود ہے۔

آغازِ تخلیقِ کائنات سے پہلے ارواحِ انسانیہ کی تخلیق

آج کے اس نظریہ تخلیق میں حقیقت انسان کے حوالے سے ایک اہم بات کا تذکرہ موجود نہیں ہے‘ وہ یہ کہ اس Big Bang یعنی مادی کائنات کی شروعات سے پہلے بھی ایک دور ہے جسے سائنس نہ دیکھ سکتی ہے‘ نہ جان سکتی ہے‘ نہ اس تک اس کی پہنچ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ایک حرف ’’کُنْ‘‘ سے ایک بہت بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا جس سے اس مادی کائنات کا آغاز ہوا‘ اسی طرح اس سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ کے اوّلین حرفِ کُنْ سے ایک بہت لطیف نور پیدا ہوا۔ اس کو لطیف نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مرحلہ پر اس میں نہ حرارت تھی اور نہ حرکت۔ پھر اس لطیف نور سے انسانی ارواح اور فرشتے پیدا کیے گئے۔ (واضح رہے کہ یہ اس عظیم دھماکے سے پہلے (Pre Big Bang) کا معاملہ ہے۔) ارواحِ انسانیہ اور فرشتے مادہ نہیں ہیں اور ان کا تعلق اس مادی کائنات (material universe) سے نہیں ہے—— اُس وقت انسانی وجود موجود نہیں تھے‘ صرف ارواح تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس دنیا میں قیامت تک آنے

والے آخری انسان تک کی روح موجود تھی اور اُس وقت اللہ نے ان سے ’’عہد الست‘‘ لیا تھا: ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَہِدۡنَا ۚۛ﴾ (الاعراف:۱۷۲) ’’کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں‘ ہم اس پر گواہ ہیں۔‘‘

عہد لینے کا یہ واقعہ عالم ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا جبکہ انسانی جسم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب جو آدمی اس بات کو نہیں مانتا وہ کیسے سمجھے گا کہ کس سے اور کس وقت یہ عہد لیا گیا تھا؟ جدید دور کے ایک مفسّر نے اپنی تفسیر میں لکھا تھا کہ ’’یہ عہد انسان کی تخلیق سے قبل عالم غیب میں لیا گیا تھا‘‘۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کا یہ جملہ تو مہمل ہے‘ اس لیے کہ جو شے پیدا ہی نہیں ہوئی اس سے کیسے عہد لے لیا گیا؟ عہد اور معاہدہ ہوتا ہی ان کے درمیان ہے جو موجود ہوں اور پھر اس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ میں بقائمی ہوش و حواس (full consciousness کے ساتھ) اقرار کرتا ہوں‘ عہد کرتا ہوں‘ معاہدہ کرتا ہوں۔ میرے توجہ دلانے پر انہوں نے تسلیم کیا کہ آپ کا موقف ٹھیک ہے کہ یہ عہد اجسادِ انسانیہ کی تخلیق سے قبل ارواحِ انسانیہ سے عالم ارواح میں لیا گیا تھا۔

یہاں وہ مشہور روایت بھی نوٹ کر لیجیے جو روحِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ))[۱] ’’پہلی شے اللہ نے جو تخلیق کی وہ میرا نور تھا‘‘۔ بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کے ہاں تو یہ روایت قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے‘ لیکن اہلِ حدیث مکتبہ فکر‘ جو روایت اور سند پر زیادہ زور دینے والے ہیں‘ وہ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے۔

عالمِ ارواح میں وقت کا کوئی تصور نہیں

عالمِ ارواح میں‘ جبکہ ابھی مادی دنیا (material world) کی شروعات نہیں ہوئی تھیں‘ جاری وقت (serial time) کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمِ ارواح میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں وقت نہیں لگتا۔ صرف ایک حرف ’’کُنْ‘‘ سے تمام ارواح انسانیہ وجود میں آ گئیں۔ البتہ عالمِ خلق میں آ کر تخلیق کے مراحل میں وقت لگتا

(۱) شرح المواقف للسیوطی: ۱۲

ہے‘ جیسے آسمان اور زمین کے متعلق آتا ہے کہ یہ چھ دنوں میں پیدا کیے گئے‘ اور وہ دن ہمارے چوبیس گھنٹوں والے دن نہیں ہیں‘ بلکہ چھ ادوار ہیں۔ اسی طرح انسان کے نطفے سے لے کر ایک بچے کے مکمل ہونے تک نو مہینے لگتے ہیں۔ الغرض عالم خلق میں تو وقت لگتا ہے لیکن عالم ارواح میں وقت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبریل کو عرشِ معلّٰی سے یہاں آنے میں کوئی وقت نہیں لگتا‘ اس لیے کہ فرشتے اس دور کی تخلیق ہیں جبکہ ٹائم ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ time and space کا تصور تو بگ بینگ کے بعد کا ہے۔ اسی طرح حرکت کا تعلق بھی وقت کے تصور کے ساتھ ہے۔ لہٰذا یہ ارواحِ انسانیہ اس دور میں پیدا کی گئیں جبکہ ابھی مادی کائنات کی ابتدا نہیں ہوئی تھی اور پھر ان کو ایک ’’کولڈ سٹوریج‘‘ میں رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد تنزلات اور ارتقاء کا لمبا سفر شروع ہوا۔

’’تنزلات‘‘ اور ’’ارتقاء‘‘ کی اصطلاحات فلسفہ میں ایک دوسرے کے متضاد سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم فلسفیوں نے تخلیق کائنات کے بارے میں منطق کے زور پر اپنے تصورات پیش کیے اور عقولِ عشرہ‘ نُہ افلاک‘ تنزلاتِ ستّہ اور تنزلاتِ خمسہ تجویز کیے۔ ان تصورات کے مطابق سب سے پہلے وجود باری تعالیٰ سے عقلِ اوّل وجود میں آئی۔ عقلِ اول سے پھر فلکِ اول اور پھر فلکِ ثانی وغیرہ —— لیکن ان تصورات کی کوئی دلیل نہ تو قرآن یا حدیث میں ہے اور نہ ہی سائنس ان کی تائید کرتی ہے۔

انسان کا مادۂ تخلیق ’’مٹی‘‘ اور جنّوں کا ’’آگ‘‘

کائنات کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں میری سوچ مطالعہ قرآن حکیم اور سائنس کی روشنی میں بنی ہے اور آپ کو اس پورے تصور اور سائنس کے درمیان مکمل ہم آہنگی نظر آئے گی۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے کلمہ ’’کُنْ‘‘ سے نور کی تخلیق ہوئی‘ جبکہ اس نور میں ابھی نہ حرارت تھی اور نہ حرکت‘ اور پھر اس نور سے ارواحِ انسانیہ اور ملائکہ کی تخلیق ہوئی۔ اس کے بعد Big Bang کے نتیجے میں شدید ترین حرارت رکھنے والے ذرات وجود میں آئے۔ اس دَور میں جِنّات پیدا کیے گئے۔ قرآن مجید جنّات کی تخلیق کے حوالے سے کہتا ہے: ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ

مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ﴿۱۵﴾﴾ (الرحمٰن) ’’اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا‘‘۔ سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۶﴾ وَ الۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ﴿۲۷﴾﴾ ’’اور ہم نے انسان کو سنے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا۔ اور اس سے پہلے جنات کو بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا‘‘۔ بادِ سموم اس ہوا کو کہتے ہیں جس میں آگ جیسی تپش ہو۔ سخت لُو خاص طور پر صحرا کی لُو سے آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اس حرارت سے جنات پیدا کیے گئے۔ یہ جنات اس زمین کی پیداوار نہیں ہیں‘ مٹی کی پیداوار نہیں ہیں‘ بلکہ یہ ایک لطیف ترشے سے بنے ہیں‘ جبکہ ہم انسان تو مٹی سے بنے ہیں‘ چاہے ارتقاء (evolution) کے لمبے process کے ذریعے بنے ہوں یا ہماری بلاواسطہ تخلیق (direct creation) ہوئی ہو‘ لیکن ہیں تو مٹی سے۔ اس بارے میں تو قرآن اور سائنس دونوں متفق ہیں کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ سائنس بھی کہتی ہے کہ انسان کی تخلیق مٹی (crust of the earth) سے ہوئی ہے اور قرآن بھی کہتا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ﴾ (المؤمن:۶۷) ’’(اللہ ہی وہ ذات ہے) جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا‘‘۔ سورۂ صٓ میں فرمایا: ﴿اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۱﴾﴾ ’’جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہ میں ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں مٹی سے‘‘۔ سورۃ الانبیاء میں ہر ذی حیات کے منبع حیات کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ﴾ (آیت ۳۰) ’’اور ہم نے بنایا ہر زندہ چیز کو پانی سے‘‘ —— چنانچہ ہر شے میں حیات کا سرچشمہ اور منبع پانی ہے اور حیواناتِ ارضی‘ جن میں انسان بھی شامل ہے‘ کا مادۂ تخلیق مٹی ہے۔ سائنس کا بھی یہی نکتہ نظر ہے کہ زمین پر سمندروں کے وجود میں آنے کے بعد سمندر کے کناروں پر‘ دلدلی جگہوں پر یہ ہوتا تھا کہ کبھی پانی پیچھے ہٹ جاتا اور کبھی آگے آ جاتا۔ یہ تعامل کافی عرصہ چلتا رہا اور اس کے نتیجے میں وہاں اولاً غیر نامیاتی مرکبات (inorganic compunds) اور اس کے بعد نامیاتی مرکبات (organic compunds) وجود

میں آئے۔ اور بالآخر اسی کے اندر حیات کا جرثومہ (cell) ''امیبا'' کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد حیات کا مرحلہ وار ارتقاء ہوا اور اس کے بلند ترین مرحلے پر انسان کی تخلیق ہوئی۔ میں اِس وقت اس نظریے کی نہ تو تصدیق کر رہا ہوں اور نہ تردید' بس آپ کو اتنا بتا رہا ہوں کہ قرآن اور سائنس دونوں اس پر متفق ہیں کہ انسان کی تخلیق مٹی اور پانی سے ہوئی ہے۔ البتہ سائنس اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ جسدِ آدمؑ کی تخلیق کے بعد خالقِ کائنات نے اس وجود میں اپنی روح میں سے پھونکا۔

اس کے بعد یہی سلسلہ ہر انسان کے تخلیقی مراحل میں دہرایا جاتا ہے۔ البتہ یہاں ایک خلیہ سے رحمِ مادر میں بچہ نو ماہ میں پروان چڑھتا ہے' لیکن ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں ایک جرثومے سے انسان بننے تک کا معاملہ نو ملین سال میں ہوا ہو —— اس جرثومہ کے ارتقاء کے مراحل وہی ہیں جو ماقبل بیان ہوئے' لیکن اصل یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ آغاز سے ہی اس میں حیات ہے' اس لیے کہ وہ ہر مرحلہ میں زندہ ہے۔ باپ کی طرف سے آنے والا نطفہ بھی زندہ ہے' ماں کی طرف سے آنے والا بیضہ بھی زندہ ہے' عَلقہ بھی زندہ ہے' مُضغہ بھی زندہ ہے۔ پھر مرد کے نطفے اور ماں کے بیضہ کے امتزاج سے وجود میں آنے والا جُفتہ (zygote)' جسے قرآن نے ''نطفة امشاج'' سے تعبیر کیا ہے' وہ بھی زندہ ہے۔ پھر جب ۱۲۰ دن ہو جاتے ہیں تو اب ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' جو عالمِ ارواح سے اس انسان کی روح (جو Big Bang سے بھی کہیں پہلے وجود میں آ چکی تھی) لا کر اس کی والدہ کے رحم میں اس کا جو ہیولا وجود میں آیا ہے' اس کے اندر ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ وجود انسان کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ ہے ''حقیقتِ انسان''۔

دو موتیں اور دو زندگیاں' کیسے؟

اس حوالے سے میں ایک عجیب بات آپ کے سامنے بیان کرنے لگا ہوں' آپ میں سے اکثر لوگوں کے لیے شاید یہ نئی بات ہو۔ قرآن مجید میں سورۃ المؤمن میں اہلِ جہنم کی ایک فریاد نقل کی گئی ہے کہ جہنمی لوگ کہیں گے:

﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ

سَبِيْلٍ ﴿۱۱﴾

''اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا' پس اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا تو اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟''

اب یہ دو مرتبہ مارنا اور دو مرتبہ زندہ کرنا کیا ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ سب سے پہلے عالمِ ارواح میں ہماری تخلیق ہوئی اور پھر ہم سلا دیے گئے —— موت اور نیند ایک ہی شے ہے اور یہ دونوں آپس میں بہنیں ہیں' اسی لیے نیند سے بیداری کے وقت کی جو دعا نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے اس کے الفاظ یوں ہیں: **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ** ''تمام شکر اور حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے'' —— اس کے بعد ہماری اس دنیا میں آمد ہوئی اور ہم اس نیند سے بیدار ہو گئے۔ اس کے بعد پھر ہماری روح قبض کر لی جائے گی۔ اس حساب سے ہمارا دو مرتبہ مرنا اور دو مرتبہ زندہ ہونا ہے۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ

میرے نزدیک اس ضمن میں سب سے بڑا المیہ (the biggest tragedy) یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں پر ڈارون کے ارتقاء کا فلسفہ چھا گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہم اپنے آپ کو صرف ایک حیوان سمجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے آپ کو نسبتاً زیادہ ارتقاء یافتہ حیوان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جتنا فرق گدھے اور گھوڑے میں ہے بس اتنا ہی فرق گوریلا اور انسان میں سمجھا جاتا ہے کہ نوعیت کا فرق نہیں ہے' بس کمیت کا فرق ہے۔ اپنے آپ کو حیوان سمجھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اپنی اس عظمت سے مستغنی ہو چکے ہیں جس کی بنا پر انسان مسجودِ ملائک اور خلیفۃ اللہ قرار پایا تھا۔

پھر اس سب کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں سارا سبق' ساری رہنمائی حیوانوں کی زندگی سے حاصل کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے یورپ میں باقاعدہ لٹریچر فروغ دیا جا رہا ہے کہ حیوانوں میں چونکہ ماں' بیٹی' بہن' بیوی کا کوئی فرق نہیں ہوتا ہے اس لیے انسانوں میں بھی محرمات کا کوئی تصور نہیں ہے' یہ تو خواہ مخواہ ہم انسانوں نے ایسے

قانون بنالیے ہیں اور ایسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لی ہیں۔ اس سب کی وجہ وہی ہے کہ ہم نے اپنی عظمت کو بھلا دیا ہے اور اب ہمیں زندگی کا سارا سبق حیوانوں سے مل رہا ہے۔

انسان کے لیے اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ میرا مادی وجود تو میرا حقیر سا پہلو ہے، جبکہ میری اصل حقیقت وہ روحِ ربانی ہے جو میرے اندر پھونکی گئی ہے۔ وہ روح ربّ العالمین کی طرف سے آئی ہے اور وہیں لوٹ جائے گی: انا للہ وانا الیہ راجعون ''بے شک ہم اللہ کے ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹ جائیں گے''۔ جبکہ ہمارا یہ مادی وجود مٹی سے بنا ہے اور پھر مٹی ہی میں چلا جائے گا۔ عربی کا مقولہ ہے: كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ ''ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے''۔ روح وہاں سے آئی ہے وہیں جائے گی، جسد یہاں سے آیا ہے، یہیں رہ جائے گا۔ یہ ہے انسان کی حقیقت!

نظریہ ارتقاء کا مُوجِد ڈارون نہیں ہے

اس حوالے سے آپ ایک اور بات بھی نوٹ کر لیں کہ نظریہ ارتقاء اصل میں چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) کا نظریہ نہیں ہے۔ ارتقاء کو ڈارون کا نظریہ کہنا اور ڈارون کو اس کا موجد سمجھنا ایک بڑی غلطی ہے۔ جن لوگوں کو ان موضوعات سے دلچسپی ہو وہ اس موضوع پر میرے دو کتابچوں کا ضرور مطالعہ کریں: (i) زندگی، موت اور انسان: آئینہ قرآنی میں (ii) ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک، تنزلات و ارتقاء کے مراحل —— حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ ارضی میں ارتقاء کا تصور قدیم یونانی حکماء کے ہاں بھی موجود تھا اور اس کا نہایت واضح نقشہ صدیوں پہلے مسلمان حکماء اور علماء بھی پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ فلسفہ ارتقاء ڈارون سے لگ بھگ چھ سو برس قبل مولانا روم کی شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید ''مثنوی'' میں واضح طور پر دو مقامات پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے بڑے حکماء میں سے ابن مسکویہ نے سب سے پہلے فلسفہ ارتقاء پیش کیا۔ ڈارون نے تو ارتقاء کی صرف توجیہہ کی ہے اور اس کا جو فلسفہ ہے وہ غلط ہے، وہ تو ثابت ہی نہیں ہو سکا۔ اس کا خاص میدان علم الحیات (Biology) ہے جس میں اس نے بہت محنت کی ہے، لیکن اس میں اس کا نظریہ مانا نہیں جاتا —— میں حیوانِ انسان کی تخلیق کی حد تک

نظریہ ارتقاء کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ ہر نئی نوع (species) کے لیے اللہ کا ایک نیا حرفِ کُنْ آتا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۸۲﴾ (یٰسٓ) ''اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمالیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے: 'ہو جا' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

روحِ ربّانی، عظمتِ انسانی کا سبب

آج کے ہمارے اس خطاب کا حاصل یہ ہے کہ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے، ایک اس کا مادی وجود ہے اور ایک اس کا روحانی وجود ہے۔ انسان اصل میں اس روحانی وجود کا نام ہے جس کے سامنے فرشتے جھکائے گئے، ورنہ مادۂ تخلیق کے اعتبار سے تو جنات ہم سے بہت اونچے ہیں کہ وہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان کا وجود بہت لطیف ہے کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے اور مختلف شکلیں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ نظامِ شمسی میں بہت دور تک چلے جاتے ہیں، جبکہ ہم تو بڑے بڑے راکٹ بنا کر بھی بڑی مشکل سے چاند تک پہنچنے کا دعویٰ کر سکے ہیں، معلوم نہیں پہنچے بھی ہیں یا نہیں! اور وہ تو آسمانوں تک کی خبر لے آتے ہیں، اس لیے کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے ہیں جبکہ ابھی کہکشائیں وجود میں آ رہی تھیں۔ چنانچہ خلقت کے اعتبار سے جنّ انسان سے بلند ہیں اور انسان اس اعتبار سے بہت پست ہے۔ یہی فرق تھا جس کی بنا پر عزازیل نامی جنّ جو بعد میں ابلیس اور شیطانِ لعین قرار پایا، نے آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۷۶﴾ (صٓ)

''میں اس (آدم) سے بہتر ہوں، مجھے تو نے پیدا کیا آگ سے اور اسے پیدا کیا مٹی سے۔''

مٹی پستی کی شے ہے، جیسے اقبال نے جوابِ شکوہ میں کہا ہے ؎ ''شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!'' ابلیس اس روحِ ربانی کو نہیں سمجھتا تھا جو اس آدم کی عظمت کی دلیل ہے اور جس کے عزو شرف کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی جانب منسوب کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ دو جگہ آیا ہے:

(بقیہ صفحہ 56 پر)

بخالت: تباہ کن خصلت

عتیق الرحمٰن صدیقی

﴿فِیۡ جَنّٰتٍ ۟ؕ یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَکَکُمۡ فِیۡ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوۡا لَمۡ نَکُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمۡ نَکُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ ﴿۴۴﴾ وَکُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِیۡنَ ﴿۴۵﴾ وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۴۶﴾﴾ (المدثر)

''جو جنتوں میں ہوں گے' وہاں وہ مجرموں سے پوچھیں گے: تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے' اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے' اور ہم روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے۔''

سورۃ المدثر مکی سورہ ہے اور اس کا تعلق نبوت کے ابتدائی دور سے ہے۔ اس میں اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے ایک باہمی مکالمہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہلِ دوزخ' اہلِ جنت کے استفسار کے جواب میں اپنی ان خصلتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی بدولت وہ جہنم میں جھونک دیے گئے۔ ان میں ایک بڑی بداخلاقی یہ بھی ہے کہ وہ مساکین کو کھانا دینے میں بخل سے کام لیتے تھے۔ گویا یہ عمل ان کی بے مروتی' بے رحمی اور دنایت کا ایک مظاہرہ تھا۔ ایک انسان دوسرے انسان کو بھوک میں مبتلا دیکھے اور استطاعت رکھنے کے باوجود کھانا کھلانے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کر پائے' اسلام کی نگاہ میں یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اسے عذابِ دوزخ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ تھڑدلی اس کی شخصیت کو باعث نفرین بھی بنا دیتی ہے۔

صاحبِ مفردات القرآن بخل کے حوالے سے لکھتے ہیں: البُخل (س) اپنے جمع کردہ ذخائر کو ان جگہوں سے روک لینا جہاں اسے خرچ کرنے سے روکنا نہیں چاہیے۔ اس کے بالمقابل الجُود ہے۔ البخیل (صیغہ مبالغہ) جو بہت زیادہ بخل سے کام لیتا ہو' جیسا کہ الراحم اور الرحیم (نہایت مہربان) مبالغہ کے لیے آتا ہے۔ بخل دو قسم پر ہے' ایک یہ ہے کہ انسان اپنی

چیزوں کو خرچ کرنے سے روک لے' اور دوم یہ کہ دوسروں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرے۔ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اَلَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ ؕ﴾ (الحدید: ۲٤) یعنی جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیں۔

﴿اَلَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَیَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ﴾ (النساء:۳۷)

''(اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں) جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں' اور جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔''

یہ اللہ کے فضل کے عدم اعتراف کا باعث ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود انسان اس طرح زندگی بسر کرے جیسا کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کا روادار ہو اور نہ اللہ کے ان بندوں کی مدد کرے جو محتاج اور فقیر ہیں۔ یہ اللہ کی ناشکری اور ناسپاسی ہے کہ وہ اس کے فضل اور اس کی عطا کردہ نوازشات کو چھپائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَنۡعَمَ نِعۡمَۃً عَلٰی عَبۡدٍ اَحَبَّ اَنۡ یَظۡہَرَ اَثَرُھَا عَلَیۡہِ)) یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس کا اثر بندے پر ظاہر ہو۔ (بحوالہ تفہیم القرآن' جلد اوّل)

جزا و سزا کے عقیدہ پر کامل اور پختہ ایمان نہ رکھنے کے نتیجے میں جو قباحتیں اور رذالتیں نمو پاتی ہیں ان میں ایک خست اور بخالت بھی ہے' جس کی وجہ سے انسان اخلاص سے تہی ہوتا ہے اور دوسروں سے فیاضی برتنے سے قاصر رہتا ہے۔ طمع' لالچ' حرص اور تنگ نظری اسی اساسی نوعیت کی بداخلاقی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ اسی بنا پر اسلام میں کنجوسی کو بڑی برائی قرار دیا گیا ہے۔ نظامِ عبادات میں نماز کے بعد زکوٰۃ کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کو فوقیت حاصل ہے۔ سورۃ الماعون میں فرمایا گیا:

﴿اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ﴿۲﴾ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾﴾

''تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔''

اسلام جس حسنِ سیرت اور رفعتِ کردار کے پھول کھلانا چاہتا ہے وہ اللہ کے حضور

جواب دہی کے قوی احساس سے رونما ہوتے ہیں۔ ایسا معاشرہ ایثار‘ قربانی‘ فراخ دلی اور احساس مروّت سے عنبر فشاں ہوتا ہے۔ محبت اور خبر گیری کے ایسے مظاہر جلوہ کناں ہوتے ہیں کہ کوئی فرد نہ کسی پر ظلم ڈھاتا ہے‘ نہ یتیم کا حق مارتا ہے اور نہ اسے دھتکارتا ہے‘ اور ذلیل حرکات سے مجتنب رہتا ہے۔

صاحبِ تفہیم القرآن نے ان آیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ طعام المسکین کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتا۔ بالالفاظِ دیگر جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ دینے والے کا کھانا نہیں بلکہ اسی مسکین کا کھانا ہے‘ وہ اس کا حق ہے جو دینے والے پر عائد ہوتا ہے اور دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ اس کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہی بات سورۃ الذاریات میں بایں الفاظ فرمائی گئی ہے:

﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝١٩﴾

”اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔“

اہلِ ایمان کا وصف یہ ہے کہ وہ سائل‘ محروم‘ محتاج اور مفلس و نادار اور ضرورت مند کے حقوق سے صرفِ نظر نہیں کرتے‘ شقاوت اور قساوت ان کے قریب نہیں پھٹکتی اور وہ اللہ کے عطا کردہ انعامات کو ربِّ رحیم و کریم کے رحم و کرم سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہیں اللہ کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے‘ وہ اس کی رضا کے طالب ہوتے ہیں‘ دُنیوی نمود و نمائش‘ ریا اور ذاتی غرض سے وہ کوسوں دور ہوتے ہیں۔ جزا و سزا پر صدق دل سے ایمان ان میں بے شمار خوبیوں کی افزائش کرتا ہے‘ کتاب حکیم میں ان کی خصوصیت کو سورۃ اللیل میں اس انداز میں بیان فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝٥ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝٦ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝٧
وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝٨ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝٩ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝١٠﴾

”پس جس نے دیا اور تقویٰ اختیار کیا‘ اور اچھے انجام کی اس نے تصدیق کی‘ تو ہم اس کے لیے آسان راہ ہموار کریں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا‘ اور اس نے اچھے انجام کی تکذیب کی‘ تو ہم اس کو دشوار راہ پر ڈال دیں گے۔“

مادہ پرست ذہنیت طرح طرح کے گل کھلاتی ہے۔ خوشحال آدمی جو تعیش کی زندگی بسر کرتا ہے اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا ہے وہ اپنی خوشحالی کو اعزاز و افتخار کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ خنّاس سما جاتا ہے کہ اس کی قدر و منزلت اور عزت و احترام دولت کی وجہ سے

ہے۔ عارضی قسم کی یہ نمائشی زندگی دیرپا نہیں ہوتی۔ جب مال و دولت کا ستون دھڑام سے زمین پر گرتا ہے اور وہ مفلسی و تنگ دستی سے دوچار ہوتا ہے تو یہ عزت غتربود ہو کے رہ جاتی ہے اور وہ غربت کی اس آزمائش سے دوچار ہو کر شکوہ سنج ہونے لگتا ہے اور اس کا الزام اپنے رب پر دھرتا ہے کہ اس نے اسے ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ قرآن نے اس کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝١٧ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝١٨
وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝١٩ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝٢٠﴾ (الفجر)

”ہرگز نہیں‘ بلکہ (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے‘ اور نہ تم ترغیب دیتے ہو مسکین کو کھانا کھلانے کی‘ اور چٹ کر جاتے ہو میراث کا سارا مال‘ اور دولت سے حد درجہ محبت کرتے ہو۔“

سورۃ الھمزۃ میں بھی اس بخیل کے خال و خط بیان کیے گئے ہیں جو مال کو سینت سینت کر رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا۔ وہ غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے‘ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے‘ ان پر طعن توڑتا ہے اور یوں زر پرستی کے اثرات اس میں نمایاں ہوتے ہیں۔

﴿الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝٣ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ
فِي الْحُطَمَةِ ۝٤﴾ (الھمزۃ)

”جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا‘ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں! وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔“

سورۃ المعارج میں مال و دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جانے والوں کو دوزخ کا انتباہ کیا گیا ہے‘ جو ان کی کھال تک کھینچ لے گی۔ فرمایا:

﴿كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝١٥ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝١٧
وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝١٨﴾

”ہرگز نہیں! وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہو گی‘ جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی۔ پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری‘ اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔“

سورۃ التوبہ میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾

’’اور جو لوگ سونے اور چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔ جس دن اس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں‘ کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے لیے خزانہ بنا کر رکھا تھا‘ پس اس کا مزہ چکھو جس کو تم جمع کر کے رکھا کرتے تھے۔‘‘

سورۃ التغابن میں فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾

’’اور جو دل کی تنگی (یا نفس کی بخیلی) سے محفوظ رہے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

فوز وفلاح انہی لوگوں کا مقدر ہے جو عارضی قبضے پر رعونت اور فخر وغرور کا شکار نہیں ہوتے اور دل کھول کر اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ حماقت اور بے وقوفی سے کام لے کر دولت کو سمیٹے رکھنے سے احتراز کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ بخالت میں خیر نہیں بلکہ شر کے متعدد پہلو پنہاں ہیں۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ (آیت ۱۸۰)

’’اور جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے فضل کے معاملہ میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے‘ بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے۔ جس مال میں انہوں نے بخل کیا ہے اسی کا طوق قیامت کے روز ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔‘‘

یعنی جس دولت کو انہوں نے حرص وہوس کی بدولت دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا تھا وہ عالمِ مثال میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا۔ حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔

چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز سے معاشرہ متعدد مفاسد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اس سے دوریاں اور بیگانگیاں ہی پرورش نہیں پاتیں بلکہ کدورت‘ تنفر اور بغض وعناد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے‘ اونچ نیچ کی بدولت طبقاتی کشمکش پروان چڑھنے لگتی ہے اور انتشار وخلفشار کی وجہ سے آپس کے روابط وتعلقات میں گہری دراڑیں پڑ جاتی ہیں‘ جو بعض اوقات خونین نتائج پر منتج ہوتی ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ وسائل سکڑ کر ایک مخصوص طبقے میں مرتکز نہ ہونے پائیں‘ ان کا پھیلاؤ زیادہ ہو۔ چنانچہ اسلام نے ایسی پیش بندیوں کا اہتمام کیا کہ وسائل گنے چنے لوگوں میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔ فرمایا:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ (الحشر:۷)

’’تاکہ مال گردش نہ کرتا رہے تمہارے دولت مندوں ہی کے درمیان۔‘‘

دولت مندوں کی اکڑفوں اور رعب وداب سیم وزر کی کھنک کے گرد ہی گھومتی ہے مگر انجام کار ایسے لوگوں کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾﴾ (القصص)

’’اور کتنی ہی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنی معیشت پر اترائیں۔ اب دیکھ لو ان کے گھروں کو‘ کم ہی کوئی ان کے بعد ان گھروں میں بسا ہے۔ اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔‘‘

سورۃ التکاثر میں فرمایا:

﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾﴾

’’تم لوگوں کو زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے مستغرق کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ تم اپنی قبروں میں پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز (یہ تمہارے لیے نافع) نہیں‘ جلد ہی تم کو اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔‘‘

قرآن حکیم نے قارون کو بخالت کی ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام جن ستر افراد کو کلام الٰہی سنانے کے لیے اپنے ساتھ کوہِ طور پر لے گئے تھے‘ یہ بھی ان میں شامل تھا‘ مگر سامری کی طرح یہ بھی منافق ثابت ہوا۔ سیرت انبیاء کرام حصہ اول میں مولانا محمد عبدالرحمٰن نے حضرت عطاؒ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ قارون کو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک عظیم الشان

مدفون خزانہ مل گیا تھا جس کی وجہ سے اسے دولت کے انبار حاصل ہو گئے تھے۔ وہ اپنے مال و دولت کے نشہ میں دوسروں پر ظلم و ستم کرتا تھا۔ اس کے خزانے اتنے وسیع تھے کہ ان کی کنجیاں اگر ایک طاقتور جماعت اٹھائے تو بوجھ سے جھک جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے ایک مرتبہ اس کو نصیحت کی کہ اللہ نے تجھے بے شمار دولت و ثروت بخشی ہے' لہٰذا اس کا شکر ادا کرو اور مال کا حق زکوٰۃ و صدقات دے کر غرباء و مساکین کی مدد کرو' جیسا کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی لوگوں پر احسان کرو' مگر اس کو یہ نصیحت پسند نہ آئی اور نہایت متکبرانہ لہجہ میں جواب دیا:

﴿اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ ؕ اَوَ لَمۡ یَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَہۡلَکَ مِنۡ قَبۡلِہٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مَنۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُ قُوَّۃً وَّ اَکۡثَرُ جَمۡعًا ؕ وَ لَا یُسۡـَٔلُ عَنۡ ذُنُوۡبِہِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۷۸﴾﴾ (القصص)

’’یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔ کیا اُس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے؟ جبکہ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔‘‘

بالآخر یہ دولت و حشمت اور یہ قوت اس کے کچھ کام نہ آئی اور اس کا ٹھاٹھ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ قرآن نے کہا:

﴿فَخَسَفۡنَا بِہٖ وَ بِدَارِہِ الۡاَرۡضَ ۟ فَمَا کَانَ لَہٗ مِنۡ فِئَۃٍ یَّنۡصُرُوۡنَہٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ٭ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُنۡتَصِرِیۡنَ ﴿۸۱﴾﴾ (القصص)

’’آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا' پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔‘‘

حضور نبی کریم ﷺ کے دور میں اس وقت کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

﴿مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾﴾ (اللھب)

’’ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔‘‘

بخیل آدمی اپنی تمام تر دولت و ثروت کے باوجود اطمینانِ قلب سے محروم رہتا ہے۔ وہ جس عزت و آبرو پر اتراتا اور غراتا ہے وہ حقیقی عزت نہیں ہوتی۔ لوگ اسے پسند نہیں کرتے' ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے' فقیر اور سائل اسے بددعائیں دیتے ہیں' یہاں تک کہ اس

کے اہل خانہ بھی اس سے خوش نہیں ہوتے۔ وہ ذہنی اذیت کا شکار رہتا ہے اور نوع بہ نوع مصیبتیں بھی اسے گھیر لیتی ہیں۔ دوست احباب اور عزیز و اقارب بھی اس سے نالاں رہتے ہیں اور جب وہ کسی مصیبت میں پھنستا ہے تو اس پر افسردہ ہونے کے بجائے مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ زندگی کے آخری لمحات میں وہ کف افسوس ملتا ہے مگر اب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ عرقِ انفعال کے قطرے اس کے کسی کام نہیں آتے۔ سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا:

﴿وَ اَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰﴾﴾

’’اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) اس میں سے جو روزی ہم نے تم کو دی ہے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی دیر اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔‘‘

بخالت' احادیث مبارکہ کی روشنی میں

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے قرآن مجید کی روشنی میں یہ واضح کیا کہ بخالت اخلاقی اعتبار سے ایک تباہ کن برائی ہے۔ اپنی کمائی دوسروں پر خرچ کرنا ایک اچھائی بھی ہے اور عبادت بھی' جبکہ مستحقین پر خرچ نہ کرنا اور دوسروں کے کام آنے میں تنگ دلی سے کام لینا نہ صرف ایک بڑی برائی ہے بلکہ بے رحمی اور سخت دلی کی ایک کراہت آمیز صورت بھی ہے۔ ذیل میں نبی محترم ﷺ کے فرمودات پیش کیے جا رہے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلسَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِنَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِنَ الْجَنَّۃِ قَرِیْبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِنَ النَّارِ' وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِنَ اللّٰہِ بَعِیْدٌ مِنَ الْجَنَّۃِ بَعِیْدٌ مِنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِنَ النَّارِ' وَلَجَاھِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ عَالِمٍ بَخِیْلٍ)) (۱)

’’سخی بندہ اللہ سے قریب ہے (یعنی اس کو قربِ خداوندی حاصل ہے) اور وہ جنت سے قریب ہے' نیز اللہ کے بندوں سے بھی قریب ہے (یعنی اللہ کے بندے سخاوت کی صفت کی وجہ سے اس سے تعلق اور محبت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں) جبکہ دوزخ سے دور ہے۔ اور بخیل آدمی اللہ سے دور (یعنی قربِ خداوندی کی نعمت سے

محروم) ہے‘ جنت سے بھی دور ہے اور اللہ کے بندوں سے بھی دور ہے (کیونکہ اس کی کنجوسی کی وجہ سے وہ اس سے الگ اور بے تعلق رہتے ہیں) جبکہ دوزخ کے قریب ہے —اور بلاشبہ ایک بے علم سخی اللہ تعالیٰ کو ایک کنجوس عالم سے زیادہ پیارا ہے۔‘‘

جو بندے اپنی کمائی اور اپنی محنت دوسرے ضرورت مندوں پر خرچ کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ خزانۂ غیب سے ان کو برابر عطا فرماتا رہے گا اور وہ ہمیشہ فقر و فاقہ کی تکلیف سے محفوظ رکھے جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو ارشاد ہے :

((اَنۡفِقۡ یَا ابۡنَ آدَمَ اُنۡفِقۡ عَلَیۡکَ)) (۲)

’’اے آدم کے بیٹے! تم دوسروں پر خرچ کرتے رہو‘ میں تم پر خرچ کرتا رہوں گا۔‘‘

حضور نبی کریم ﷺ سوال کرنے والے کو واپس نہیں کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپؐ کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ تھا تو آپؐ نے قرض منگوا کر دیا۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ کَانَ لِیْ مِثْلُ اُحُدٍ ذَھَبًا لَسَرَّنِیْ اَنْ لَا تَمُرَّ عَلَیَّ ثَلَاثُ لَیَالٍ وَعِنْدِیْ مِنْہُ شَیْءٌ اِلَّا شَیْئًا اَرْصُدُہٗ لِدَیْنٍ)) (۳)

’’اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو تو میری خوشی یہی ہو گی کہ مجھ پر تین راتیں بھی ایسی نہ گزریں کہ میرے پاس اس میں سے کچھ بھی باقی ہو بجز اس کے کہ میں کسی قرض کی ادائیگی کے لیے اس میں سے کچھ روک لوں۔‘‘

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْاِیْمَانُ فِیْ قَلْبِ عَبْدٍ اَبَدًا)) (۴)

’’بخل اور ایمان کبھی کسی انسان کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے (یعنی کنجوسی اور ایمان کا کوئی جوڑ نہیں)۔‘‘

بخل خطرناک اور تباہ کن عادات میں سے ہے اور یہ جنت کی راہ میں رکاوٹ بننے والی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ خِبٌّ وَلَا مَنَّانٌ وَلَا بَخِیْلٌ)) (۵)

’’دھوکہ باز‘ احسان جتانے والا اور بخیل جنت میں نہیں جائیں گے۔‘‘

حواشی

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلۃ‘ باب ما جاء فی السخاء۔

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب النفقات‘ باب فضل النفقۃ علی الاھل۔

(۳) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب قول النبی ﷺ ما احب ان لی مثل اُحد ذھبا۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الزکاۃ‘ باب تغلیظ عقوبۃ من لا یؤدی الزکاۃ۔

(۴) سنن النسائی‘ کتاب الجھاد‘ باب فضل من عمل فی سبیل اللہ علی قدمہ۔

(۵) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلۃ والآداب‘ باب ما جاء فی البخیل۔

بقیہ: انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقتِ انسان

﴿فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ﴾

(الحجر:۲۹۔ ص:۷۲)

’’پھر جب میں اس (انسان) کی تخلیق مکمل کر دوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب تم سب گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں۔‘‘

یہ بڑے گہرے مضامین ہیں اور بدقسمتی سے آج ہم ان چیزوں سے بہت دور چلے گئے ہیں‘ اسی لیے سورۃ الحشر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ﴾ (الحشر:۱۹) ’’اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔‘‘

آج ہم اپنی عظمت سے غافل ہیں۔ ہم تو مسجودِ ملائک ہیں‘ لیکن آج ہماری سوچ یہ ہے کہ ہم حیوانوں میں سے بس ایک حیوان ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتّب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون)

علامہ اقبال کی قرآن فہمی

محمد احمد بلال

میثاق کے گزشتہ شماروں میں علامہ اقبال کی قرآن فہمی کے حوالے سے ایک خاص موقف سامنے آیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد چند سال قبل انٹرنیٹ کے ایک Blog پر لکھا گیا انگریزی essay ذہن میں اُبھر آیا' جس کا عنوان تھا Deconstructing Iqbal's 'Reconstruction'۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ اور آپ کے متعلقین کا موقف بھی ذہنوں میں تازہ کر لیا جائے' کیونکہ یقینی بات ہے کہ میری طرح تنظیم اسلامی کے عام رفقاء کے ذہن میں علامہ اقبال کے فہمِ قرآن سے متعلق سوالات ضرور اُبھرے ہوں گے۔ میرے نزدیک یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبال کا پیش کردہ عمرانی فکر اور منہجِ انقلاب دراصل وہ اثاثہ ہیں جن کو محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مزید واضح کرتے ہوئے آگے بڑھایا۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں فکرِ اسلامی کی تجدید اور منہجِ انقلاب کی تدوین کے ضمن میں کی گئی اب تک کی مساعی کو نقصان پہنچائے بغیر آگے بڑھا جائے اور اپنے اسلاف پر نقد کرنے کی بجائے مستشرقین کی پیدا کردہ گمراہیوں کو رفع کیا جائے۔ اسلاف سے یہاں میری مراد علامہ اقبال ہیں۔ (مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ)۔

اہمیت

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ایک تحریر سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''علامہ اقبال نے یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کو روحِ قرآن کا ظہور اور بروز' اور عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تصور کو نورِ محمدی ﷺ سے ماخوذ اور مستعار قرار دینے' اور اسلام کے علم کلام کو افلاطونی تصورات کی دلدل اور ارسطو کی منطق کی بھول بھلیوں سے نکال کر جدید تجرباتی علوم کی اساس پر استوار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جانب مغرب کے دو جدید عمرانی نظریات اور بنیادی سیاسی تصورات پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مغربی تہذیب کو بڑی خوداعتمادی

اور جرأتِ رندانہ کے ساتھ چیلنج کیا' اور دوسری جانب نہ صرف یہ کہ اسلام کے اصل انقلابی فکر کی پوری ''مجددانہ شان'' کے ساتھ ازسرِنو تدوین کا فریضہ سرانجام دیا اور اللہ کے رسول ﷺ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو عہدِ حاضر کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر اور حقوقِ انسانی کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا' بلکہ انقلاب کا زوردار نعرہ لگاتے ہوئے اس کے منہج اور منہاج کو بھی کمال اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا۔''(۱)

فہمِ قرآن

محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی تالیف ''علامہ اقبال اور ہم'' سے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

''پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے' اور احیاءِ اسلام کا واحد ذریعہ ہے تجدیدِ ایمان' اور ایمان کا واحد منبع و سرچشمہ ہے قرآن حکیم' اور دورِ حاضر میں احیاءِ قرآن کا ایک نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے فکر و کلامِ اقبال!

اس لیے کہ جیسے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ عہدِ حاضر کے ذہنی و فکری ظروف و احوال میں قرآن حکیم کی عظمت کا جس قدر انکشاف اقبال پر ہوا' اور کسی پر نہیں ہوا —— اور موجودہ دور کی اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر قرآن کے علم و حکمت اور ہدایت و معرفت کی تعبیر و تبیین اور تشریح و توضیح کی ہے صرف —— اور صرف اقبال نے!''(۲)

''عہدِ حاضر میں عظمتِ قرآن کا سب سے بڑا انکشاف علامہ اقبال پر ہوا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال کو عہدِ حاضر کا ترجمان القرآن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ اس دور میں قرآن مجید کے عظیم ترین معجزہ ہونے کی سب سے بڑی علامت علامہ اقبال کی ذات ہے۔''(۳)

''......مولانا امین احسن اصلاحی آنکھ کے آپریشن کے لیے لاہور میں مقیم تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی تو فرصت کے اس وقت کا مصرف مولانا نے یہ نکالا کہ علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا۔ لاہور کے تمام رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر طویل عرصے تک ایک خاص کیفیت مولانا پر طاری رہی اور حسبِ عادت مولانا نے اپنے تأثر کا اظہار بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں فرمایا۔ اس سلسلے میں مولانا کے تأثر کی شدت کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل دو جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جو راقم

الحروف کے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں:

ایک یہ کہ ''قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!''

دوسرے یہ کہ ''اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اس امت میں پیدا ہوا لیکن یہ امت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہوگا!''(۴)

سید نذیر نیازی مرحوم کو علامہ اقبال کے قریب رہنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کی سعادت میسر رہی۔ وہ علامہ اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے جو کچھ کہا' جو کچھ سوچا' جو کچھ لکھا' شعر ہو یا فلسفہ قرآن مجید ہی میں تدبّر اور تفکّر کی بدولت...... زمانہ طالب علمی ہی میں جب انہیں قرآن مجید میں تدبّر اور تفکّر کا سبق دیا جا رہا تھا ان کے والد محترم بھی انہیں یہی وصیت کرتے۔ ایک روز کہنے لگے قرآن مجید پڑھتے تو ہو اسے سمجھتے بھی ہو؟ یاد رکھو! قرآن مجید پڑھنے ہی سے نہیں دل کے راستے سے بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اسے پڑھو تو یوں سمجھو جیسے قرآن مجید تمھارے دل پر نازل ہو رہا ہے۔

ایک دن علامہ اقبال کہنے لگے فلسفہ ہو یا سائنس' زندگی اور اس کے مسائل' کوئی عقدہ جو حل ہوتا نظر نہ آئے تو قرآن مجید سے رجوع کرتا ہوں۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافت شائع ہوا اور اس کے ماتحت یہ ماننا لازم ٹھہرا کہ کائنات اضافہ پذیر ہے تو میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ کئی دن سوچتا رہا' بالآخر ایک روز اس پریشانی میں دفعتاً خیال آیا کہ کیوں نہ قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کروں۔ قرآن مجید کھولا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب پہلی آیت جس پر میری نگاہ پڑی یہ تھی: ''يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ''۔ میں سمجھ گیا۔ میری مشکل حل ہو گئی۔''(۵)

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'' میں رقم طراز ہیں:

''بہر حال علی گڑھ اور دیوبند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملت اسلامیہ ہند کے محیط میں 'فکرِ قرآنی' کے تین سوتے اور چھوٹے جنہیں مجموعی طور پر synthesis سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علامہ اقبال مرحوم جو معروف و متداول معنوں میں تو نہ مترجم قرآن تھے نہ مفسرِ قرآن' بلکہ ان کی تعلیم بھی نہ کسی دار العلوم میں ہوئی تھی' نہ جامعہ اسلامیہ میں۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے۔ بایں ہمہ قرآن حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے ان کا مقام یقیناً ''رومی ثانی'' کا

ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ ''مناجات بحضور سید المرسلین ﷺ'' میں یہ تک کہہ دیا کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن   ایں خیاباں را زِ خارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا   بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

''اگر میرے دل کی مثال اس آئینہ کی سی ہو جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو' اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور کی ترجمانی ہے' تو (اے نبی ﷺ) آپ میرے فکر کے ناموس کا پردہ خود ہی چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں۔ (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رُسوا کر دیں (اور سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں۔''

چنانچہ ان کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سرور' محبتِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ ملّی سے مملو ہیں ہی' اُن کے 'خطبات' بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر مطالعہ قرآن حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علامہ مرحوم نے جدید ریاضیات و طبیعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآنِ حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دورِ حاضر میں دین و مذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے۔

رہا 'فکر قرآنی' کا اوّل الذکر دھارا جس میں علامہ اقبال مرحوم کو تن تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا بقیہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلق اس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و شاداب خطے میں اقامت گزیں ہونے کی دعوت علامہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علامہ مرحوم کے سب سے بڑے غالباً صحیح تر الفاظ میں واحد شیدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں۔''(۶)

علامہ اقبال کی مناجات بحضور سرور کونین ﷺ ''گر دلم آئینۂ بے جوہر است...... الخ'' پر ڈاکٹر اسرار احمد تبصرہ فرماتے ہیں:

''یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ لیکن ان کے اس دعوے کی صداقت کی میں گواہی دے رہا ہوں' اور میری گواہی کی بنیاد میرا قرآن سے وہ پچاس سالہ تعلق ہے جو اللہ نے مجھے عطا کیا ہے۔''(۷)

پیغام

سید نذیر نیازی کے الفاظ ہیں:

''اقبال کا کوئی پیغام تھا تو یہی کہ مسلمان سمجھ لیں کہ ان کی زندگی قرآن مجید سے ہے۔ قرآن مجید میں فکر ونظر سے کام لیں‘ اس کی تعلیمات پر عمل کریں‘ قرآن مجید ہی ان کا ایک سرمایہ ہے۔ یہی ان کا پیغام تھا جسے انہوں نے طرح طرح سے پیش کیا۔ شعر میں‘ فکر میں‘ تحریر و تقریر میں‘ گفتگوؤں میں‘ اُٹھتے بیٹھتے‘ سوتے جاگتے‘ کوئی معاملہ ہو‘ کوئی مسئلہ‘ علم وحکمت کی بحث ہو‘ تہذیب وتمدّن یا ادب اور فن‘ سیاست اور معاش‘ فرد کی زندگی‘ جماعت کے مفاد‘ انسان‘ اس کے ضمیر اور باطن‘ احوال وواردات امورِ عالم کی غرضیکہ کوئی موضوع ہو بالآخر قرآن مجید ہی پر ختم ہوتا۔ قرآن مجید ہی نے ان کے فکر کو جلا دی۔ قرآن مجید نے ہی ان کی شاعری میں وہ کیفیت‘ وہ درد وسوز اور ذوق وشوق پیدا کیا جس کا سرچشمہ ایمان میں نے عرض کیا تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور اگر ہم نے اقبال کو سمجھ لیا ہے تو جیسا کہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اس تعلیم کا خاتمہ بھی قرآن مجید ہی پر ہوا۔ آخری عمر میں بھی ان کی کوئی خواہش تھی تو یہی کہ قرآن مجید کے معارف اور حِکَم پر قلم اُٹھائیں۔ زندگی کے آخری لمحے آئے تو یہی آرزو کہ قرآن مجید سنیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا‘ جب زندگی ہو یا آخرت اس کا رشتہ قرآن مجید ہی سے وابستہ ہے۔ انہوں نے کہا ہے اور خوب کہا:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن اس ''بقرآن زیستن'' کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد میں جو نوعِ انسانی کو ازل سے درپیش ہے‘ جس میں تاریخ کی حیثیت ایک لمحے کی ہے‘ جس میں اقوام وامم کیے بعد دیگرے ایسے اُبھرتی ہیں جیسے کسی بہتی ہوئی ندی میں پانی کے بلبلے‘ جس میں تہذیب وتمدن نے کئی رنگ بدلے‘ چشمِ فلک نے کئی انقلاب دیکھے اور جس کا سلسلہ اس لیے جاری ہے اور جاری رہے گا کہ انسان اپنے مدعا ومنتہا کو پالے‘ ہم اس جِدّوجُہد میں مردانہ وار حصہ لیں۔ اسے اسلام کے قالب میں ڈھال دیں۔ یہ مقصد وعظ ونصیحت اور تحریر وتقریر سے حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن مجید پر عمل کرنے سے۔''(۸)

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لَا تَخَفْ — می رساند بر مقامِ لَا تَخَفْ

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغت اللہ گفتہ ام
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست — جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام — تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام!

''(اے مسلمان) اگر دوام وثبات اور قوت واستحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دستِ سوال دراز کر۔ اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آبِ حیات کا سراغ ملا ہے!—— یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا‘ بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں نہ خوف باقی رہتا ہے (نہ حزن!)—— میں نے قرآن کے بحرِ بیکراں کے موتی بیندھ لیے ہیں اور ''صبغۃ اللّٰہ'' کے اسرار ورموز کی شرح بیان کر دی ہے۔ میرے فکر کی یہ بلندی اور گردوں نوردی سراسر قرآن ہی کے فیض سے ہے اور اسی کے طفیل میرے خیالات میں بحرِ بیکراں کی سی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا یعنی میرے فکر اور پیغام سے سرشار ہو کر آمادہ عمل ہو جا‘ تاکہ شمشیر برہنہ کے مانند چمکنے لگے!''

علامہ اقبال کے یہاں بعض تعبیرات مذہب کے Conservative Viewpoint سے ہٹ کے ہیں۔ مثلاً سورۃ الاحزاب کی آیت: ''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے‘ مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا''۔ یہاں علامہ اقبال اس مذکورہ امانت کو ''خودی'' قرار دیتے ہیں۔ اس پر علامہ اقبال کے ایک نقاد H.A.R Gibb کہتے ہیں کہ اس پر علامہ کوئی سند تو پیش کر نہیں رہے ہیں اور اپنے طور پر ہی اس کی تعبیر پیش کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کو معنی پہنا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا ماننا تھا کہ قرآن کسی ایک ہی زمانے کے انسان کی رہنمائی کے لیے نہیں آیا‘ بلکہ:

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

''اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہاں آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں۔''

نئی تعبیر کیوں؟

سید نذیر نیازی نے اپنے مقالے میں فرمایا:

''پھر جس طرح اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے خواہ دنیا بھر کے درخت قلم اور سمندر روشنائی بن جائیں' بعینہٖ ان کی تشریح و تفسیر' تبلیغ و تبیین کا بھی کوئی اختتام ہے نہ انتہا' عقل طرح طرح سے ان کی طرف بڑھے گی۔ فکر ایک کے بعد دوسرا تصور قائم کرے گا۔ علم پر نئے نئے حقائق منکشف ہوں گے۔ عمل سے کئی ایک عقدوں کی گرہ کھلتی رہے گی۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اولایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

''وہ زندہ کتاب قرآنِ حکیم جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی۔ زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔''

لہٰذا ایک بات ہے جس کا اس ضمن میں سمجھ لینا ضروری ہے' جس کی طرف اگرچہ اقبال نے اشارہ بھی کر دیا تھا مگر جس پر بہت کم توجہ کی گئی اور وہ یہ ہے کہ چونکہ زندگی سرتاسر خلاقی اور تازہ کاری ہے اس لیے تجربے اور مشاہدے کی طرح علم و حکمت اور فکر و وجدان کی دنیا بھی ایک تغیر پذیر دنیا ہے۔ اسی سے اس کی ہستی اور وجود قائم' یہی اس کی حرکت اور یہی اس کی طلب اور جستجو کا راز۔ وہ ایک لامتناہی سفر ہے جس میں اگرچہ کوئی مرحلہ اور کوئی ساعت آخری نہیں لیکن جس میں ہم لازماً کسی مقام پر ہوں گے اور اسی مقام سے ماضی و حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایک خاص موقف قائم کرتے ہوئے ایک نئی امید اور نئے اعتماد کے ساتھ منتظر رہیں گے کہ ہماری طلب و جستجو سے جو حقائق واشگاف ہوئے مستقبل میں وہ کس انداز میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ بعینہٖ جیسے ایک کوہ پیما ایک بلندی کی طرف بڑھتا ہے تو اگرچہ وہ مناظر بار بار اس کے سامنے آتے ہیں جن کو وہ اس سے پہلے دیکھ آیا تھا مگر اب ہر لحظہ ایک نئے رنگ میں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عقل اور فکر کا ہے' کہ ہمارے تصورات بھی جن کو ہم آخری اور قطعی سمجھتے ہیں' آخری اور قطعی نہیں ہوتے۔ حقیقت ایک ہے اور لامتناہی۔ جیسے جیسے ہم عقل اور فکر کے سہارے اس کی طرف بڑھیں گے ہمارے وہ تصورات بھی جو قطعی اور یقینی لہٰذا خالی از صداقت نہیں تھے' ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ نئے نئے تصورات قائم ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن ایک خاص وقت میں جب حقیقت کا کوئی پہلو اجاگر ہوا اور اس موقف کی رعایت سے جو ایک خاص عمر میں عقل اور فکر نے قائم کیا کیونکہ بغیر اس کے کوئی دوسرا موقف

ممکن ہی نہیں تھا تو ہم جو کچھ کہیں گے اس موقف کا لحاظ رکھتے ہوئے تاکہ اسے دوسروں تک پہنچا سکیں' مگر جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ ہم نے حقیقت کو موقوف یا اس طرح جو تصورات قائم ہوئے ان کے تابع کر دیا۔ جس ذہنی فضا میں سانس لے رہے ہیں اس کی برتری تسلیم کر لی۔ حالانکہ ہم نے جو کچھ کہا محض سہولت افہام و تفہیم کے لیے۔[۹]

ڈاکٹر احمد افضال لکھتے ہیں:

"Iqbal has quoted his father anonymously in prose as well as when he wrote that, "no understanding of the Holy Book is possible until it is actually revealed to the believer just as it was revealed to the Prophet."

ترے ضمیر پہ جب تک نہ نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

"Why is personal experience such a crucial element for understanding the Holy Qur'an? Written texts, especially sacred and authoritative ones, have a tendency to appear static and fixed in a way that seems to allow only a single set of "correct" meanings. This apparent rigidity of written texts and their seemingly monolithic message stem not from the texts themselves but from the unique configuration of situations, perceptions, and needs that shape the "horizon" of particular interpretive communities. It is only when the readers pay constant attention to the flux of their own experiences in relation to their encounters with the sacred text that they come to appreciate the dynamic character not only of their own experiences but also, and more importantly, they come to see the kaleidoscopic character of their interaction with the text. The insistence on a single "correct" understanding then becomes impossible to maintain, and it is increasingly replaced by a joyful anticipation of fresh meanings as the sacred texbegins to reveal some of its infinite possibilities.''[۱۰]

اقبال کہتے ہیں: قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید (قلندر جو بات کہتا ہے دیکھ کر کہتا ہے) یعنی یہ ان کے ذہن سے نکلی ہوئی بات نہیں ہے' یہ ان کا عین مشاہدہ ہے۔ اس میں کسی آورد کے کہیں

دور تک آثار نہیں‘ آمد ہی آمد ہے۔

علامہ اقبال قرآن کی تاویل کے حوالے سے علماءِ حق کے موقف کے قائل تھے۔ چنانچہ آیتِ نور (اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کے بارے میں جب ایک مغربی مصنف کے خیال کی‘ جس نے اسے ایک خاص دعوے کی تائید میں پیش کیا تھا‘ تردید کی اور کہا اس آیت کا اشارہ اس حقیقت کی طرف نہیں ہے جو مصنف کے ذہن میں ہے‘ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں ایک دوسری حقیقت کی طرف۔ تو اعتراض ہوا کہ اقبال نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے صحیح نہیں۔ صحیح تاویل کچھ اور ہے جسے میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے اپنے عنایت نامے میں لکھا کہ تاویل تو معترض کر رہا ہے‘ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ مصنف مذکور کے نزدیک اس آیت کا اشارہ جس حقیقت کی طرف ہے صحیح نہیں۔ میں تاویل کا قائل نہیں ہوں‘ میرا مذہب اس معاملے میں وہی ہے جو ابن حزمؒ کا۔(۱۱)

اور دوسری جانب تاویل کرنے والوں پر کچھ اس انداز میں تنقید فرماتے ہیں:

زمن بر صوفی و مُلّا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شان در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

علامہ اقبال کا ماننا تھا کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ کلام میں متکلم کی تمام شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قرآن مجید میں منعکس ہیں‘ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی کر بھی کیسے سکتا ہے؟

حرفِ اُو را ریب نے‘ تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

’’اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردوبدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔‘‘

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست‘ چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں

’’(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے علانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں‘ کچھ اور ہی شے ہے۔ یہ ذاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی اور جیتی جاگتی بولتی بھی

ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!‘‘

آخر میں اپنا ایک احساس درج کرنا چاہتا ہوں اور جیسا کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا کہنا بھی ہے کہ فقہی انداز میں قرآن کو پڑھنا ضروری تو ہے مگر قرآن فہمی کا یہی ایک واحد منہج نہیں ہے‘ کیونکہ قرآن محض قانون کی کتاب نہیں ہے‘ بلکہ اس سے انسان کی سوچ اور فکر کی تطہیر ہوتی ہے۔ اس امت کے تنِ مردہ میں دوبارہ جان ڈالنے والے علامہ اقبال مرحوم نے جس انداز میں قرآن کو سمجھنے کی روایت ڈالی‘ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس امت کے محسن ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین!

حوالہ جات

(۱) برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید وتعمیل اور اس سے انحراف کی راہیں
(۲) فکرِ اقبال کی روشنی میں حالات حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں (ڈاکٹر اسرار احمد)
(۳) دورِ حاضر کا ترجمان القرآن اور داعیٔ قرآن: علامہ اقبال‘ از ڈاکٹر اسرار احمد (۹ نومبر ۲۰۰۰ء)
(۴) علامہ اقبال اور ہم (ڈاکٹر اسرار احمد)
(۵) اقبال اور قرآن (سید نذیر نیازی)
(۶) دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر‘ از ڈاکٹر اسرار احمدؒ
(۷) دورِ حاضر کا ترجمان القرآن اور داعیٔ قرآن: علامہ اقبال از ڈاکٹر اسرار احمد (۹ نومبر ۲۰۰۰ء)
(۸) اقبال اور قرآن (سید نذیر نیازی)
(۹) اقبال اور قرآن (سید نذیر نیازی)
(۱۰) Iqbal's Approach to the Qur'an
(۱۱) اقبال اور قرآن (سید نذیر نیازی)

نوٹ: ’’اقبال اور قرآن‘‘ مقالہ محترم سید نذیر نیازی نے انجمن خدام القرآن کی جانب سے منعقدہ قرآن کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اب یہ محترم ڈاکٹر صاحب کی تالیف ’’علامہ اقبال اور ہم‘‘ کا حصہ ہے‘ جو مرکزی انجمن خدام القرآن کی جانب سے شائع کی جاتی ہے۔

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

حقوق وفرائض (۲)

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

نبی اکرم ﷺ کا اُمتِ مُسلمہ کے ساتھ حقوق وفرائض کا تعلق

سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے' جو کہ نبی اکرم ﷺ اور اہل ایمان کے باہم حقوق وفرائض سے متعلق ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے بہت واضح کر دیا ہے:

﴿وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ط﴾ (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح (اے اہلِ ایمان) ہم نے تمہیں اُمتِ وسط بنایا تا کہ تم (دوسرے لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسولؐ تم پر گواہ بن جائیں۔''

حقوق وفرائض کی یہ لڑی تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے: نبی مکرم ﷺ' اُمتِ مسلمہ اور غیر مسلم۔ نبی مکرم ﷺ کو حکم ہے اہل ایمان پر گواہ بننے کا اور اہل ایمان کو حکم ہے غیر مسلموں پر گواہ بننے کا۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ط﴾ (آیت ۶۷)

''اے رسولؐ! جو آپؐ کی طرف تیرے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیں' اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو آپؐ نے پہنچانے کا حق ادا نہ کیا۔''

گویا رسالت کے فرضِ منصبی کو احسن طریقے سے ادا کرنا نبی اکرم ﷺ کا فرض قرار دیا گیا اور اسی طرح یہ اُمت کا حق ٹھہرا۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا مقصد اور اُمتِ مسلمہ پر حق' ایمان داری اور دیانت داری سے اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ اور پھر یہ گواہی نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے مجمع سے لی تھی:

((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''کیا میں نے پہنچا نہیں دیا؟''

تو جواب ملا:

بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ وَکَشَفْتَ الْغُمَّۃَ

''ہاں کیوں نہیں اے اللہ کے رسولؐ! بے شک ہم سب گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا کر دیا' امانت کو پورا پورا ادا کر دیا' اُمت کو نصیحت کر دی' اور اندھیروں اور گمراہیوں کو دور کر دیا۔''

نبی اکرم ﷺ نے اُمتِ مسلمہ سے حق کی گواہی لینے کے بعد اللہ تعالیٰ کو بھی گواہ بنایا اور تین بار فرمایا: اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ۔ شہادت علی الناس کے اس فریضے کی ادائیگی میں (جو آپؐ پر اللہ کی طرف سے عائد تھا) نبی اکرم ﷺ نے ۲۳ سال کے عرصے میں اپنا تَن مَن دُھن لگا دیا۔ نہ دن کے چین' نہ رات کے سکون کی پروا کی اور نہ کسی شخص سے جواباً کسی اجر یا معاوضے کی توقع کی۔ جب حق کی ادائیگی میں رشتہ داروں کی طرف سے مخالفتیں آنے لگیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی پُرزور حکم ہوا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ یعنی آپؐ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کو ڈنکے کی چوٹ بیان کریں۔ پھر اُمت کی طرف سے بڑی گواہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جو اللہ کی طرف سے ذمہ داری عائد کی گئی تھی اس کو کماحقہ ادا فرما دیا۔ آخر میں یہ حق اُمت پر ڈال دیا کہ ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) ''پس جو موجود ہیں انہیں چاہیے کہ ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں!''

دنیا میں گواہی لینے کے بعد قیامت کے روز نبی اکرم ﷺ کو شہادت علی الناس کی گواہی دوبارہ دینی ہوگی:

﴿فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ ۢبِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا ﴿۴۱﴾﴾ (النساء)

''پس اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو ان پر گواہ بنائیں گے۔''

اس آیت پر رسول اللہ ﷺ گریہ وزاری کرتے تھے کہ مجھے قیامت کے روز اپنی اُمت کے خلاف گواہی دینی ہوگی۔ اسی طرح ہم بھی اپنے فرائض احساسِ جواب دہی سے ادا کریں کہ

قیامت کے روز شہادت علی الناس کی ادائیگی پر رسوائی نہ ہو۔

اُمتِ مُسلمہ پر نبی اکرم ﷺ کا حق

(یہ مضمون محترم والد صاحبؒ کی تحریر ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔)

اُمت مسلمہ پر نبی اکرم ﷺ کا حق ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق یہ ہے:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (الاعراف)

''پس جو لوگ اس نبیؐ پر ایمان لائے‘ ان کی حمایت کی‘ ان کی مدد کی‘ اور اس نور کی پیروی کی جو اُن پر نازل کیا گیا‘ وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

ع ''دے تو بھی محمد ﷺ کی صداقت کی گواہی'' کے مطابق یہ ہمارا فرض ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو دل و جان سے رسول ماننے کے بعد ان چاروں ذرائع سے ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں اور رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اُسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنائیں۔ یہ صرف ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا حق بھی ہے۔ اگر ہم اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کریں گے‘ جیسا کہ ہم سب کرتے ہیں‘ تو یاد رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ بھی قیامت کے دن ہمارے خلاف گواہی دیں گے اور نوعِ انسانی (عموماً) اور اُمت مسلمہ (خصوصاً) کے وہ افراد جن تک قرآن وسنت کی صحیح تعلیمات نہیں پہنچیں وہ سب بھی ہمارے خلاف گواہی دیں گے اور وہ دن لازماً آ کر رہے گا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ﴾ عدل وانصاف کا ترازو ربّ العالمین لازماً رکھیں گے اور پھر گواہیاں میرے حق میں بہت کم اور میرے خلاف بہت زیادہ ہوں گی۔ میں نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھوں گی اور شفاعت کی امیدوار ہوں گی‘ لیکن اندیشہ ہے کہ پیارے نبی ﷺ اُس روز منہ موڑ لیں گے۔ اس لیے کہ دنیا میں نبی اکرم ﷺ نے واضح کر دیا تھا کہ جو میرے راستے اور شریعت کے علاوہ کسی اور قوم کے راستے یا طریقے پر چلا ہوگا تو قیامت کے دن میرا اُمتی ہونے کے باوجود میں اس سے منہ موڑ لوں گا۔ صرف درود وسلام پڑھ لینے اور نبی اکرم ﷺ کا نام آنے پر انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگا لینے سے نجات نہیں ہوگی اور نہ ہی نبی اکرم ﷺ کا ایک بھی حق ادا ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ہمارا اوّلین فرض ﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ﴾ ہے کہ ہم دل و

جان سے اُن کو رسولؐ مانیں اور اس بات کا یقین رکھیں کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اگر دل میں یقین ہوگا تو اعمال میں اُسوۂ حسنہ کی چنگاری ضرور نظر آئے گی۔ (ان شاء اللہ)

دوسرا فرض ہم پر یہ ہے کہ ہم حضرت محمد ﷺ کی تعظیم کریں ﴿وَعَزَّرُوْهُ﴾۔ نبی اکرم ﷺ کی تعظیم (ذاتی طور پر) یعنی آپؐ کی آمد پر کھڑے ہونا تو آپؐ کو اس وقت بھی ناپسند تھا جب آپؐ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بنفس نفیس موجود تھے۔ ایک دفعہ جب صحابہ کرامؓ نبی اکرم ﷺ کی آمد پر کھڑے ہوئے تو آپؐ نے انہیں روکا کہ میری آمد پر کھڑے نہ ہوا کرو‘ میں تمہارے جیسا ہی ایک انسان ہوں۔ ان کو اللہ کا رسول ماننے پر اگر دل و جان سے یقین ہے تو ان کے فرمودات‘ ارشادات‘ احکامات‘ ان کے اقوال اور ان کی احادیثِ مبارکہ کا صدفی صد احترام ہمارے دلوں میں ہوگا اور ہم مندرجہ بالا تمام افعال خود کرنے کی کوشش کریں گے۔ پھر تو یہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیم اور آپؐ سے محبت کا تقاضا اور لازمی نتیجہ ہوگا کہ میں آپؐ کی ناپسندیدہ باتوں اور گناہوں سے اجتناب کروں اور پوری زندگی اللہ کے ساتھ ساتھ نبی اکرم ﷺ کی نافرمانی سے بچتی رہوں اور آپؐ کی بتائی ہوئی تمام حسنات پر دل و جان سے عمل پیرا رہوں‘ اس یقین کے ساتھ کہ قیامت کے دن ہمیں ان کی معیت نصیب ہو جائے۔ یہ تعظیم ہے آپؐ پر ایمان کا لازمی تقاضا اور آپؐ کا دوسرا حق۔

ہم پر آپؐ کا تیسرا فرض ہے کہ ہم ان کی مدد کریں ﴿وَنَصَرُوْهُ﴾۔ اپنی حیاتِ مبارکہ میں بھی نبی اکرم ﷺ نے ذاتی طور پر کسی سے مدد نہیں لی۔ یہاں تک کہ اگر آپؐ سواری پر ہوتے اور آپؐ کا عصا مبارک زمین پر گر جاتا تو غلام جو ساتھ ہوتا اس کو بھی نہیں اٹھانے دیتے بلکہ خود سواری سے اترتے اور اپنا عصا مبارک اٹھا لیتے۔ اسی طرح اپنے حجرے میں خود جھاڑو دے دیا کرتے تھے‘ کپڑوں میں پیوند لگا لیا کرتے تھے۔ دنیا میں بھی آپؐ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ پر پوری طرح عامل تھے۔ یہاں میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گی کہ ہم اس معاملے میں آپؐ کے بالکل برعکس ہیں بلکہ مخالف ہیں۔ ہم اپنا ہر کام دوسروں سے حکماً‘ جبراً کروانے کی خواہش کرتے ہیں اور ڈھٹائی سے کرواتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری حاکمیت اور ہماری بڑائی کا تقاضا ہے کہ دوسرے ہمارے کام کریں۔ معاذ اللہ! کیا ہماری بڑائی نبی اکرم ﷺ کی بڑائی اور عظمت سے بڑھ گئی ہے یا ہمارا اسوہ نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی اور ہے؟ افسوس صد افسوس ہے ہماری حالت اور ہمارا اُمتی ہونے پر کہ ہم اپنا کام ہی خود نہیں کرتے تو دوسروں کی مدد کیا کریں گے؟ اِلا ماشاء اللہ۔ نبی اکرم ﷺ کی مدد آپؐ کے رسالت کے مشن کی مدد ہے جو تا قیامِ

قیامت جاری وساری رہے گا۔ ''نبوت'' نبی اکرم ﷺ پر ختم ہوگئی مگر رسالت کا کام ابھی باقی ہے۔

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

اور ع ''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی''۔ یہ گواہی بھی ہے اور مدد بھی کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے امتی ہیں۔ یہ گواہی ہمارے اقوال میں' ہمارے افعال میں' ہمارے اخلاق و کردار میں لازمی طور پر نظر آنی چاہیے۔ یہ اُن کی مدد ہے۔ اور دوسری مدد یہ ہے کہ قرآن پاک اور سنت رسول کو انتہائی دیانت داری اور ایمان داری سے دوسروں تک پہنچائیں۔ اپنی زندگی کو اسی مقصد میں لگا دیں' کھپا دیں۔

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے' ٹھکانے لگا دے اسے

گویا ﴿نَصَرُوْهُ﴾ میں دو طرح سے مدد کا مفہوم پوشیدہ ہے:

(۱) خود ذاتی طور پر اُسوۂ رسول سے مزین ہونا۔ اور

(۲) شہادت علی الناس کی ادائیگی میں آپؐ کے دست و بازو بننا۔

اپنا فرض اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اگر ہم نے آپؐ کے مشن (تبلیغ و دعوت) میں آپؐ کی مدد نہ کی تو آپؐ قیامت کے دن ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔ جیسے ایک بچی اپنی ماں کے کام کاج میں ان کی مدد کرتی ہے اور ایک بیٹا والد کا دست و بازو بننے کے لیے ان کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے یا کام کراتا ہے' بالکل اسی طرح ہم پر نبی اکرم ﷺ کا حق ہے کہ ہم آپؐ کے دست و بازو بنیں۔ اب اسلام نافذ کرنے کے لیے رسولوں نے تو نہیں آنا۔ یہ کام خود ہم نے کرنا ہے' اور اپنا تن من دھن لگا کر رسالت کا کام آگے پہنچانا ہے۔ ہم نبی اکرم ﷺ کے اس مشن میں مددگار ثابت ہوں گے تو اللہ بھی ہماری مدد کرے گا۔ اور اس دنیا میں بھی فتح و نصرت ہمارا مقدر ہوگی' اور آخرت میں تو کامیابی ان شاء اللہ ضرور ہوگی۔

بعض اوقات دنیا میں رسول اللہ ﷺ کا سچا امتی بننے پر لازماً مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ﴿نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ﴾ کا نقشہ سامنے آتا ہے' لیکن یہ بھی بندۂ مؤمن کی آزمائش اور اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ بقول شاعر۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

چوتھا فرض ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾ ہے۔ اس نور یعنی قرآن پاک کا اتباع کریں تو آپ ﷺ کا چوتھا حق ادا ہوگا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ فرض کبھی بھی ساقط نہیں ہوتا' یہ عملاً کرنے سے ادا ہوتا ہے (الا یہ کہ مرنے کے بعد)۔ یہ بہت بڑی حجت ہے ہمارے خلاف کہ ہم حاملِ قرآن ہوتے ہوئے بھی محرومینِ قرآن میں سے ہیں' اور رسول اللہ ﷺ کے اُمتی ہونے کے باوجود ہمارا کردار' ہمارے اعمال' ہمارا اخلاق' ہمارا معاشرہ سب قرآن سے خالی ہے۔ گویا ہم نبی اکرم ﷺ کا یہ حق کھلم کھلا تلف کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں اخروٹ کا چھلکا تو ہے مگر ہم اس کے گودے سے محروم ہیں۔ (الا ماشاء اللہ!)

قرآن کے ہم پر پانچ حقوق ہیں' جو ان شاء اللہ آگے بیان ہوں گے۔ ان کو محبت اور شوق سے ادا کریں گے تو ہمارا فائدہ ہے۔ قرآن ہمارے حق میں گواہی دے گا' رسولؐ بھی ہمارے حق میں گواہی دیں گے۔ ہم قرآن پر عمل کیے بغیر رسول اللہ ﷺ کا ایک حق بھی ادا نہیں کر سکتے۔ جب آپؐ کی پوری زندگی اور آپؐ کا اخلاق بھی قرآن کے مطابق تھا' تو آپؐ کے ماننے والوں کا فرض صرف تسبیحات و وظائف اور صرف حلیہ بنانے سے کیسے ادا ہوسکتا ہے؟ یا اپنی مرضی سے کچھ احکامات مان لینے اور کچھ جانتے بوجھتے چھوڑ دینے سے کیسے ہوسکتا ہے؟ قرآن ذاتی کردار سازی کی بھی معراج ہے اور اجتماعی نظام زندگی کی بھی۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتاب زندۂ
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں!

(جاری ہے)

موبائل فون کے فوائد ونقصانات
اور اس کے استعمال کے آداب

حافظ شعیب احمد☆

موبائل فون کو اپنی ایجاد کے ابتدائی دور میں اُمراء اور طبقہ اشرافیہ نے غالباً نمائشِ دولت وثروت کے لیے ہاتھوں ہاتھ لیا‘ متوسط طبقہ نے بطور فیشن اختیار کیا اور اب وہ وقت آیا ہے کہ یہ سوغات ہر کہ ومہ کی ضرورتِ زندگی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

موبائل فون کی حیثیت درحقیقت اس تلوار ونشتر کی ہے جس کا جائز وناجائز استعمال موبائل ہولڈر کے ذاتی اختیار میں ہے۔ اب یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا درست اور مناسب استعمال کرے‘ مگر آج بدقسمتی سے بیشتر خواتین وحضرات اس بارے میں غیر ذمہ دارانہ رویہ کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نتیجتاً موبائل کے فوائد کے جلو میں اس کے نقصانات بھی بے پایاں نظر آتے ہیں۔ ذیل میں موبائل فون کے فوائد ونقصانات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

موبائل فون کے فوائد

موبائل فون یقیناً اس اعتبار سے ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کے فوائد ومنافع نے انسانی زندگی میں بہت ساری مثبت تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں اور یہ انسان کے لیے کئی سہولتوں کا باعث بنا ہے۔ اس کی بدولت فاصلے مزید سکڑ گئے ہیں‘ تجارتی لین دین میں بڑی تیزی آ گئی ہے‘ جس سے معاشی ترقی کی رفتار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وہ لوگ جو دیارِ غیر میں اپنے پیاروں سے سینکڑوں ہزاروں میل دور رابطہ کے لیے ہفتوں بلکہ مہینوں بعد ڈاک خرچ برداشت کر کے یا پھر ٹیلیفون کے ذریعہ روابط استوار کرتے تھے اب تو موبائل فون کے ذریعے تقریباً ہر وقت رابطہ میں

☆ لیکچرر گورنمنٹ کالج‘ جڑانوالہ

رہتے ہیں۔ اس طرح یقیناً یہ آپس کے تعلقات (صلہ رحمی) کو بہتر اور مضبوط بنانے میں بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ مگر دورِ حاضر کا یہ بھی ایک عجیب المیہ ہے کہ جدید ذرائع مواصلات (means of communication)‘ جس میں بالخصوص موبائل بھی شامل ہے‘ کے ذریعے انسان کے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک رابطے ہیں‘ مگر گھر کی دیوار سے متصل ہمسایہ کی تکلیف و پریشانی کی اسے خبر نہیں ہوتی‘ کیونکہ دلوں سے ہمدردی وغم خواری کے جذبات کی گرمی غالباً ختم ہو کر سرد ہو چکی ہے۔

موبائل فون صرف دور دراز رابطہ کا ایک وسیلہ وذریعہ ہی نہیں بلکہ اس میں کیلکولیٹر (calculator) اور گھڑی بھی ہے‘ اور اس کی بدولت اب گھڑی باندھنے کا رواج بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس چھوٹی سی اطلاعاتی مشین میں اب تو کیمرہ‘ ایف ایم ریڈیو اور انٹرنیٹ تک استعمال کرنے کی سہولت دستیاب ہے۔ مزید برآں مووی کیمرہ کے ذریعے ہر وقت گزرتے لمحات (حسین ہوں یا غیر حسین) کو بھی محفوظ کرنے کی سہولت میسر ہو چکی ہے۔ اس کا اہم فائدہ داعیانِ اسلام کو یہ ہوا ہے کہ message کی سہولت کو استعمال کرتے ہوئے وہ دیگر احباب کو قرآنی اقتباسات‘ احادیث رسول ﷺ خوبصورت جملے‘ اقوال‘ اشعار وغیرہ send کرتے رہتے ہیں۔ نمازِ فجر کی ادائیگی کے لیے اس میں موجود الارم کی سہولت بھی اب تو ہر کس وناکس کو میسر ہے‘ جو ادائیگی نماز کی حسن نیت رکھنے والوں کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب موبائل ہولڈرز قیامت کے دن یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ انہیں اذانِ فجر کا علم نہ ہو سکا‘ کیونکہ موبائل میں موجود الارم کی سہولت سے ان کے خلاف حجت پوری ہو چکی ہے‘ جبکہ بقیہ نمازوں کے ضمن میں اس سے قبل ہی لاؤڈ سپیکر اور گھڑی کی صورت میں حجتِ الٰہی پوری ہو چکی ہے‘ لیکن اس کے باوجود انسان غفلت وذہول کا مظاہرہ کرے تو درحقیقت وہ اپنے ہی نقصان وخسران میں اضافہ کر رہا ہے اور خود کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنا رہا ہے۔

موبائل فون کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوا ہے کہ اس کی بدولت اظہارِ حق کافی حد تک آسان ہو گیا ہے۔ وہ کلماتِ حق جو کسی بڑے کے روبرو کہنا پہلے کافی مشکل تھا‘ اب اس نعمت نے قدرے آسان بنا دیا ہے۔

موبائل فون کے نقصانات

جس طرح موبائل فون کے مذکورہ بالا فوائد ومنافع سے انکار ممکن نہیں اسی طرح اس کے

درج ذیل نقصانات کو ماننے بغیر بھی چارہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کی بے آرامی و بے سکونی میں بڑی حد تک اضافہ ہوا ہے۔ وقت بے وقت بیل (bell) بجتی ہے اور آپ نیند میں بڑبڑاتے ہوئے اسے آن (on) کر لیتے ہیں۔ یوں نیند بھی اس کی خلل اندازیوں کا شکار ہوگئی ہے۔ سفر پر جا رہے تھے' اچانک کوئی غمناک اور پریشان کن کال (call) آئی اور دورانِ سفر ہی واپسی طے ہوگئی' جبکہ اس ایجاد سے قبل لوگ عازمِ سفر ہوتے تو کم از مقصدِ سفر پورا کیے بغیر نہ پلٹتے تھے۔ ایک نقصان یہ ہوا کہ لوگوں میں جھوٹ بولنے کی عادت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ اسی کی ''برکت'' ہے کہ گھر میں موجود ہونے کے باوجود بتایا جاتا ہے کہ اس وقت صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ راقم الحروف کے ایک دوست نے بتایا کہ انہوں نے محض اس وجہ سے خود موبائل رکھنے کی بجائے بیٹے کو دے دیا ہے کہ اس کی وجہ سے کبھی غلط بیانی سے کام لینا پڑ جاتا ہے۔

اس کی بدولت لوگوں میں فضول گوئی کی عادت بھی بڑی حد تک پروان چڑھ رہی ہے اور زبان کے بے تحاشا استعمال کے رجحان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ موبائل کمپنیاں (جو دراصل ملٹی نیشنل غیر ملکی کمپنیاں ہیں) عوام الناس کو لوٹنے کے لیے نت نئے پیکجز (packages) کا اعلان کرتی رہتی ہیں اور میڈیا کے ذریعے عوام کو مزید فضول گوئی کا باہیں الفاظ درس دیتی ہیں: ''اور سناؤ'' یا ''اب کریں کھل کر بات''۔ کبھی عورتوں کو باتونی ہونے میں شہرت حاصل تھی مگر موبائل کی برکت سے اب مرد بھی کچھ پیچھے نہیں رہے۔ اس فضول گوئی سے لوگوں کے اخراجات میں بھی بے محابا اضافہ ہوا ہے۔ فضول خرچی کی عادت جو ہماری قوم میں پہلے ہی کچھ کم نہ تھی' اب اس کے گراف میں مزید بلندی آ گئی ہے۔ اس جدید ایجاد سے تجارتی کاروبار میں تیزی اور ترقی آنے کے ساتھ ساتھ سٹہ کے کاروبار میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا ہے' جس کے نقصانات میں سے ایک اہم نقصان اشیاء کی قیمتوں میں کنٹرول سے باہر ہوتا ہوا اضافہ ہے۔ قدیم زمانہ میں افواہ پھیلانے والوں کو غالباً بڑی دقت پیش آتی ہوگی' مگر موبائل نے ایسے لوگوں کی پریشانی کا بھی بڑی حد تک مداوا کر دیا ہے اور اب تو اکثر و بیشتر افواہوں کا بازار خوب گرم رہتا ہے۔

شنید یہ ہے کہ بعض افواہیں خود موبائل کمپنیاں اڑاتی ہیں۔ کچھ سنسنی خیز قسم کے message چند افراد کو ارسال کر دیے جاتے ہیں اور پھر وہ آگے اپنے عزیز و احباب تک پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ملکی سیاست کی گرمی بھی ان افواہوں کو پھیلانے میں نہایت مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ نتیجتاً اس موبائل کمپنی کے کھاتے میں لاکھوں روپے چند منٹ میں پہنچ

جاتے ہیں۔ گویا لوگوں کے مال ہتھیانے کا یہ ایک جدید طریقہ ہے۔ عصر حاضر میں غصب اور چوری کے بھی نت نئے طریقے ایجاد ہوگئے ہیں۔ بعض نوجوان لڑکے' لڑکی کی آواز نکال کر فون پر پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اوّلین مطالبہ کارڈ feed کرانے کا کیا جاتا ہے۔ عشق کے اندھے اس مسحور کن آواز کے جادو کا شکار ہو کر بیلنس لوڈ (load) کرانے کے مطالبات تسلیم کیے چلے جاتے ہیں۔ بعض باخبر افراد کی اطلاع کے مطابق بیلنس چوری کرنے کا گھناؤنا فعل موبائل کمپنیوں کے بعض اہلکار ہی انجام دیتے ہیں' کیونکہ عام آدمی کو عموماً اس گُر کا علم ہی نہیں ہوتا۔ کبھی پیکج پر مبنی میسج اصل کمپنی کا گمان پیدا کر کے بھیجا جاتا ہے' جیسے Telenor کی بجائے Telenori۔ اور اگر موبائل ہولڈر اس پیغام کے مطابق اقدام کرلے تو وہ سم میں موجود اپنے بیلنس سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لہٰذا ان نئی طرز کے چوروں اور حرام خوروں سے نہایت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

سسی پنوں' ہیر رانجھا' لیلیٰ مجنوں' اور سوہنی مہینوال کے معاشقے کی مثالیں یوں تو ہر دور میں مل جاتی ہیں مگر عصر حاضر میں اس سلسلہ میں موبائل فون کا استعمال عشاق حضرات کے لیے وصال کے مواقع بہم پہنچانے میں بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ اس کی بدولت کئی معزز خاندانوں کی عزت خاک میں مل چکی ہے اور کئی خاندان بس دو چار ہوا چاہتے ہیں (اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ) لہٰذا یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ موبائل فون کے غلط استعمال کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کی روک تھام کے لیے والدین کی تربیتِ اولاد کے حوالے سے ذمہ داری پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی ہے۔

موبائل فون کے غلط اور بے جا استعمال کے نتیجہ میں جو نقصانات بڑی خوفناک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں ان میں اخلاقی بے راہ روی اور بدکاری کو فروغ حاصل ہونا ہے۔ نہایت بیہودہ اور فحش قسم کے SMS کا باہم تبادلہ کیا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے متعدد ویب سائٹس کے علاوہ اب تو بیسیوں Message books بھی بازار میں دستیاب ہیں۔ موبائل میں گندی فحش اور عریاں تصاویر' فحش گانے ہمارے نوجوان طبقہ کے ذہن و فکر کو آلودہ کر رہے ہیں اور یہ بات قومی تباہی اور ہماری رہی سہی اخلاقی حالت کے زوال کا باعث بن سکتی ہے۔ کبھی زمینی' سمندری اور فضائی آلودگی کا چرچا تھا' مگر اب آلودگی کی اقسام میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا میڈیا کی آلودگی (media pollution) اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ذہنی و فکری آلودگی دراصل نئی اقسام ہیں۔

کبھی ہماری ثقافتی روایات میں ایک روایت تسبیح وغیرہ ہاتھ میں لیے اللہ کا ذکر کرنا اور درود شریف وغیرہ پڑھنا تھی‘ مگر اب اس کی جگہ موبائل پر موجود games نے لے لی ہے‘ اور بچے تو کجا بعض بھلے چنگے سیانے سمجھ دار لوگ بھی اس کے دامِ فریب میں پھنسے نظر آتے ہیں‘ حالانکہ یہ نہایت لغو اور فضول و بے کار مشغلہ ہے‘ جس سے نہ کوئی ذہنی ریاضت اور نہ ہی جسمانی ورزش ہوتی ہے‘ بلکہ یہ تو محض وقت کا ضیاع ہے۔ وہ وقت جس کی اہمیت بعض دانشوروں نے بایں الفاظ بتلائی ہے: اَلْوَقْتُ اَثْمَنُ مِنَ الذَّھَبِ (وقت سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے)۔

حقیقت یہ ہے کہ موبائل فون کے غلط استعمال نے ہماری معاشرت کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور اس کے مضر اثرات نہایت بھیانک شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس جدید ایجاد نے ہماری تعلیمی پسماندگی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ کلاس روم میں بعض طلبہ و طالبات موبائل پر گیمز کھیلتے مصروف نظر آتے ہیں اور کلاس سے باہر تو شاید کام ہی messages کا تبادلہ ہوتا ہے۔ دورانِ سبق بعض معمارانِ قوم‘ اساتذہ کرام بھی کال کرتے یا وصول کرتے نظر آتے ہیں جو یقیناً کوئی اچھی صورتِ حال نہیں ہے‘ کیونکہ اساتذہ کرام کو تو role model بننا ہوتا ہے‘ مگر جب قائدین و رہنمایانِ قوم کی صورت حال ہی ابتر ہو جائے تو پھر اس قوم کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔ اس کے کثرتِ استعمال سے بصارت اور سماعت بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ یہ وہ سوغات ہے جو اچانک گر جائے‘ گم ہو جائے یا کوئی جیب کترا اپنا فن دکھا جائے تو پھر شدید ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے‘ اور اب تو بعض سر پھرے نوجوانوں کا مسافروں اور راہگیروں کے ہاتھوں سے موبائل جھپٹنے اور چھیننے کے واقعات بھی سننے میں آتے رہتے ہیں۔

موبائل فون میں لوگ اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق ring tones سیٹ کراتے ہیں‘ کسی کے موبائل سے تلاوتِ قرآن‘ نعت کی آواز آئے تو فوراً اس شخص کے ذہنی رجحانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے‘ اور جن اصحاب نے گانے وغیرہ کی tones بھروا رکھی ہوں تو وہ بھی ان کے اندرونی و باطنی جذبات و احساسات کی ترجمانی کر دیتی ہیں۔ گھنٹی بجنے کی آواز اور موسیقی کو نبی کریم ﷺ نے نہایت ناپسند فرمایا ہے‘ مگر کیسا پُرفتن دور ہے کہ اب موبائل کی گھنٹیاں اور موسیقی کی آوازیں مساجد میں بھی سنائی دیتی رہتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر معاملہ گانوں کی tones کا ہے‘ جو کبھی اچانک کسی نمازی کے موبائل سے مسجد میں گونج اٹھتی ہیں۔ اس طرح ایک حرام کام جو بالعموم ممنوع ہے‘ مسجد کے تقدس کو پامال کرتا نظر آتا ہے۔ نتیجتاً ہماری بے حضور نمازوں میں جو تھوڑا بہت خشوع وخضوع تھا وہ بھی جنس نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

تلاوتِ قرآن کو بطور ring tone استعمال کرنا درست نہیں ہے‘ کیونکہ قرآن جیسی اعلیٰ و ارفع شے کا ایک ادنیٰ مقصد کے لیے استعمال قطعاً نامناسب ہے۔

نوخیز ڈرائیورز کے دورانِ ڈرائیونگ موبائل استعمال کرنے کی وجہ سے حادثات کی شرح میں بھی کسی قدر اضافہ ہوا ہے۔ کبھی لوگ اپنے حافظہ کی صلاحیت کا استعمال زیادہ کرتے تھے اور کسی اہم بات کو تحریر کرنے کی بجائے حافظہ میں محفوظ کرنے کو ترجیح دیتے تھے‘ مگر اب ہر چیز کو کمپیوٹر اور موبائل میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پہلے لوگوں کو اپنے عزیز و اقارب کے ٹیلیفون نمبرز زبانی یاد ہوتے تھے‘ مگر اب موبائل میں فون نمبرز محفوظ کرنے کی سہولت کی وجہ سے قوتِ حافظہ بھی متاثر ہو رہی ہے۔

نقصانات سے محفوظ رہنے کے لیے تدابیر

گزشتہ سطور میں موبائل فون کے جن نقصانات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا بنظر غائر جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر دراصل ہمارے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں‘ جن سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس اطلاعاتی مشین کا جائز اور مناسب استعمال کیا جائے۔ فضول خرچی‘ فضول گوئی‘ بیہودہ گوئی اور لغویات سے خود کو بچایا جائے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات کو ہمہ وقت ذہن میں متحضر رکھنا چاہیے:

i ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ﴾ (الاسراء:۲۷)
’’یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔‘‘

ii ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــــُٔوْلًا ۝۳۶﴾ (الاسراء)
’’یقیناً کان‘ آنکھ اور دل کے بارے سوال کیا جائے گا (کہ ان کا استعمال درست کیا تھا یا غلط!)‘‘

iii ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸﴾ (قٓ)
’’جب بھی وہ (انسان) کوئی بات کرتا ہے تو فوراً ایک نگران (لکھنے کے لیے) تیار ہوتا ہے۔‘‘

iv ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۹﴾ (النور)
’’یقیناً وہ لوگ جو اہلِ ایمان میں فحاشی وعریانی اور بدکاری کا فروغ چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔‘‘

v ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝۷۲﴾ (الفرقان)

''(رحمٰن کے بندے) جب لغویات کے قریب سے گزرتے ہیں تو (دامن بچا کر) عزت سے گزر جاتے ہیں۔''

ملاقات کے شرعی آداب کی روشنی میں موبائل کا درست استعمال

عصرِ حاضر میں موبائل فون ملاقات کا ایک اہم ذریعہ ہے اور ہماری شریعت میں نہایت تفصیل کے ساتھ آدابِ ملاقات بتا دیے گئے ہیں۔ لہٰذا موبائل کا استعمال ان شرعی آدابِ ملاقات کی روشنی میں ہی کیا جانا چاہیے۔ ذیل میں ان آداب کی روشنی میں موبائل کے استعمال پر قدرے تفصیل سے خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔

(۱) ملاقات کے ارادے سے کسی کے دروازے پر دستک دیں تو اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ صرف تین بار دستک دی جائے' اگر کچھ جواب مل جائے تو فبہا ورنہ واپس چلے آئیں۔ (صحیح بخاری' حدیث: ۶۲۴۵)۔ اسی طرح موبائل فون پر بھی تین بار bell دے دی جائے۔ (ایک بیل سے مراد اس کا مسلسل چلتے رہنا ہے) اور اس کے بعد مزید bells دینے سے گریز کیا جائے۔ البتہ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ شرفِ ملاقات کی کوشش کر لی جائے۔

(۲) بیل دینے سے قبل وقت کا بھی احساس کر لیں کہ یہ وقت کہیں آرام یا نماز کا تو نہیں۔ لہٰذا اس حوالے سے متعلقہ شخص کو بے آرام (disturb) نہ کیا جائے۔

(۳) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر گھر والے آنے والے ملاقاتی سے فی الوقت ملاقات نہ کرنے کا اظہار کریں اور واپس جانے کی درخواست کریں تو ملاقاتی کو اس پر چیں بہ جبیں نہ ہو جانا چاہیے بلکہ خوش دلی سے چلے جانا چاہیے (النور ۲۸)۔ اس کی روشنی میں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ موبائل فون پر بھی اگر متعلقہ شخص کہے کہ وہ فی الوقت مصروف ہے لہٰذا تھوڑی دیر بعد رابطہ کیا جائے تو اس پر ملاقاتی شخص کو ناراض نہ ہونا چاہیے۔

(۴) گفتگو کا آغاز ''ہیلو'' کے بجائے سنت کے مطابق السلام علیکم سے ہونا چاہیے اور اختتام بھی السلام علیکم کے ساتھ ہو۔ بعض احباب آغاز تو السلام علیکم کے ساتھ کرتے ہیں مگر اختتام OK اللہ حافظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس کے ساتھ ہی السلام علیکم بھی کہہ لیا جائے تا کہ سنت پر عمل ہو سکے۔ (دیکھئے سنن ابی داوٗد' حدیث: ۵۲۰۸۔ جامع ترمذی' حدیث: ۲۷۰۷)

(۵) فضول گوئی اور بیہودہ گوئی سے بہر صورت اجتناب کیا جانا چاہیے' ورنہ یہی زبان کا غلط استعمال لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو جہنم میں اوندھے منہ گرائے جانے کا باعث بن جائے گا۔

(جامع ترمذی' حدیث: ۲۶۱۶ و سنن ابن ماجہ' حدیث: ۳۹۷۳)

بعض حضرات گفتگو کا آغاز ''پہچانا؟'' جیسے الفاظ سے کرتے ہیں' یعنی نہ سلام نہ دعا' اور اس طرح وقت ضائع کرتے ہوئے فضول خرچی کے مرتکب ہوتے ہیں' اور بعض لوگ سلام پہچان کے بغیر ہی اصل مدعا کہنے لگ جاتے ہیں اور اپنے کنجوس و بخیل ہونے کا ثبوت دیتے ہیں' جبکہ یہ دونوں طرزِ عمل درست نہیں۔ بندۂ مؤمن نہ تو فضول خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی بخیل و کنجوس' بلکہ وہ میانہ روی اور احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ (الفرقان: ۶۷)

(٦) گفتگو کا آغاز سلام کے بعد اپنی واضح پہچان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ دروازے پر دستک دینے والے سے اہل خانہ پوچھیں کہ باہر کون ہے؟ اور ملاقاتی کہے ''میں!'' تو اس انداز سے غیر واضح جواب دینے کو رسول اللہ ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے (صحیح بخاری' حدیث: ۶۲۵۰)۔ لہٰذا واضح طور پر اپنا نام وغیرہ بتا کر پہچان کرائی جائے۔

(۷) مسجد میں داخل ہوتے ہی موبائل فون بند کر لیا جائے' کیونکہ اب اللہ خالق و مالک سے ملاقات کا وقت ہے نہ کہ مخلوق سے۔ نیز اگر خدانخواستہ دورانِ نماز کال آ گئی تو نماز کا خشوع و خضوع متاثر ہوگا۔

بعض بھائی نماز سے قبل موبائل کو بند کرنے کے بجائے viberation (تھرتھراہٹ) پر لگا دیتے ہیں' حالانکہ اس سے بھی کال آنے پر نہ صرف نماز میں اپنا خشوع و خضوع متاثر ہوتا ہے بلکہ تھرتھراہٹ کا احساس ساتھ والے نمازی کو بھی ہو جاتا ہے' جو یقیناً نماز میں خلل کا باعث ہے۔ لہٰذا نماز میں خشوع و خضوع کے حصولِ کامل کا تقاضا ہے کہ نماز میں موبائل مکمل طور پر بند کر دیا جائے یا silent پر رکھا جائے۔ اگر خدانخواستہ نماز سے قبل موبائل فون بند کرنا یاد نہ رہے تو اسے نماز میں کال آنے پر بند کیا جا سکتا ہے اور اس مجبوری کی حرکات و سکنات کا صحت نماز پر کوئی اثر نہ ہوگا' کیونکہ اس بارے حدیث میں صریح رہنمائی ہمارے لیے موجود ہے جس کو امام شوکانیؒ کے ایک دلچسپ جواب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ آپؒ سے کسی شخص نے استفسار کیا کہ دورانِ نماز عمامہ (پگڑی) گر جائے تو کیا اٹھایا جا سکتا ہے؟ آپؒ نے جواباً ارشاد فرمایا: ہاں عمامہ اٹھایا جا سکتا ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ کا امامہؓ بنت زینب (نواسیٔ رسول) کو اٹھا کر نماز پڑھنا' بوقت سجدہ زمین پر بٹھانا' پھر قیام کے موقع پر دوبارہ اٹھا لینا ثابت ہے (صحیح بخاری: ۵۱۶)۔ اس واقعہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نماز میں موبائل بند کرنے کے لیے معمولی حرکت کی جا سکتی ہے' جس کا نماز کی صحت پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔

مولانا وحید الدین خان

اپنے الفاظ کے آئینے میں (۴)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر☆

اس سلسلہ وار مضمون کی سابقہ تین اقساط میں ہم نے مولانا وحید الدین خان صاحب کے تصورِ علاماتِ قیامت کا جائزہ لیا تھا۔ ذیل کی قسط میں ہم ان کے تصورِ اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت کا جائزہ لے رہے ہیں۔

تصورِ اقامتِ دین یا نفاذِ شریعت

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ مولانا وحید الدین خان یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مدرسۃ الاصلاح' سرائے میر' اعظم گڑھ سے ہی حاصل کی اور ۱۹۳۸ء میں اس مدرسہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۴ء میں چھ سال بعد انہوں نے یہاں سے اپنی مذہبی تعلیم مکمل کر لی۔

اسی دوران مولانا مودودی ؒ کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی' ہند میں شامل ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ میں جماعت اسلامی کی مرکزی 'مجلس شوریٰ' کے بھی رکن بن گئے۔ جماعت اسلامی کے ترجمان رسالہ 'زندگی' میں باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ جماعت اسلامی میں شمولیت کے ۱۵ سال بعد خان صاحب نے جماعت اسلامی کو خیرباد کہا۔ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو گئے لیکن ۱۹۷۵ء میں اسے بھی مکمل طور پر چھوڑ دیا۔

اقامتِ دین' نفاذِ شریعت اور اسلام کے سیاسی پہلو کی نسبت خان صاحب کا نقطہ نظر کئی ایک تدریجی اور ارتقائی مراحل سے گزرا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں جب انہیں فکرِ مودودی سے اختلاف شروع ہوا تو پہلے پہل وہ خود بھی واضح نہ تھے کہ وہ کیا کہنا چاہ

☆اسسٹنٹ پروفیسر' سرگودھا یونیورسٹی

رہے ہیں۔ یعنی انہیں فکرِ مودودی سے اختلاف تو تھا اور اس میں وہ بالکل واضح تھے لیکن اس اختلاف کو متعین' مبین اور منضبط الفاظ کی صورت میں پیش کرنے کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنا اختلاف مخاطبین کو سمجھا نہیں پا رہے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے تحریری صورت میں اپنے خیالات کو ممکن حد تک منضبط تو کر لیا اور اس میں تا حال ردِعمل معمولی نوعیت کا تھا لیکن آہستہ آہستہ ردِعمل کی نفسیات میں اضافے کے سبب سے فکرِ مودودی کے بارے ان کا موقف غلو کے تدریجی مراحل طے کرتے ہوئے اقامت دین' نفاذ شریعت' جہاد' امامت وخلافت' سیاست' اسلامی تحریک اور اجتماعی اصلاح کی جمیع پُرامن کوششوں سے ایک ''چڑ'' کی صورت اختیار کر گیا اور اسلوبِ نقد و بیان میں بھی خوارجی منہج جیسی شدت اور انتہا پسندی کا اظہار ہونے لگا۔

مولانا مودودی ؒ سے انہیں جو اختلافات تھے' ان کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب 'تعبیر کی غلطی' میں تفصیل سے کیا ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ابتدائی حصہ مولانا صدر الدین اصلاحی' مولانا جلیل احسن ندوی' مولانا ابواللیث ندوی اور مولانا مودودی ؒ کے ساتھ خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ مولانا مودودی ؒ کے تصور و تعبیر دین کی غلطی اور اس کے نتائج کی وضاحت پر مشتمل ہے' جبکہ تیسرے حصے میں مولانا نے اپنے تئیں صحیح تصورِ دین کو پیش کیا ہے۔ فکرِ مودودی کے بارے میں خان صاحب کے نقطہ نظر کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر رہے ہیں:

پہلا دور

شروع شروع میں جب خان صاحب کو فکرِ مودودی سے اختلاف پیدا ہوا تو انہوں نے جماعت کے رفقاء سے اس کا اظہار کرنا شروع کیا' لیکن چونکہ خان صاحب تا حال اپنے اختلاف کو بیان کرنے میں اتنے واضح اور متعین نہیں تھے لہٰذا عموماً سینئر رفقائے جماعت نے ان کے اختلافات کو لفظی اختلاف کا نام دے کر معاملہ رفع کرنے کی کوشش کی۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

> ''ایک اور بزرگ جو جماعت میں انتہائی چوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں' ان سے بار بار گفتگو ہوئی مگر وہ ہمیشہ مجھ کو یہی سمجھاتے رہے کہ تم جو کچھ سوچ رہے ہو اس میں اور جماعت کے فکر میں کوئی خاص فرق نہیں' دونوں تقریباً ایک ہی ہیں۔ یہ گفتگوئیں جون ۱۹۶۰ء سے لے کر ستمبر ۱۹۶۱ء تک رامپور' دہلی اور اعظم گڑھ میں ہوئیں —— اس قسم کے اور بھی بعض افراد ہیں جنھوں نے مجھ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ محض لفظی فرق ہے' ورنہ حقیقتاً دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں...... یہ گفتگوئیں اُس وقت کی ہیں

جب کہ میری تحریر 'تعبیر کی غلطی' ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔'' (وحید الدین خان مولانا' تعبیر کی غلطی' ص ۲۴۔۲۵' مکتبہ الرسالہ' نئی دہلی' ۱۹۸۶ء)

دوسرا دور

جب خان صاحب نے مولانا مودودی ؒ سے اپنے اختلافات کو اپنی تحریر 'تعبیر کی غلطی' کی صورت میں مرتب کرلیا تو ان کے فکر مودودی سے اختلافات کی نوعیت بہت حد تک واضح اور متعین ہوکر سامنے آگئی۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''ایک بزرگ جو عالم بھی ہیں اور مجلس شوریٰ کے رکن بھی' انھوں نے تحریر دیکھنے کے بعد کہا کہ اس سے پہلے آپ سے جو مختصر باتیں ہوئی تھیں' ان سے میں نے یہ سمجھا تھا کہ آپ کو یہ اعتراض ہے کہ مولانا مودودی نے دین کی تشریح میں غلو کیا ہے' اور اس معنی میں مجھے آپ سے اتفاق تھا۔ مگر اب آپ کی تحریر دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ کا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے دین کی تعبیر ہی غلط کی ہے' اب مجھے آپ سے سخت اختلاف ہے۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۲۶)

خان صاحب کی اس دور کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فکر مودودی سے اختلاف میں فکری اعتبار سے بہت حد تک معتدل ہیں اگرچہ اسلوبِ بیان میں سختی کا عنصر موجود ہے۔ شروع شروع میں فکرِ مودودی سے ان کا اختلاف یہ تھا کہ فکر مودودی کے اجزائے ترکیبی درست ہیں لیکن ترتیب غلط ہے۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا مودودی کے لٹریچر میں دین کی جو تشریح کی گئی ہے' اس کے متعلق میرا شدید احساس ہے کہ وہ دین کے صحیح تصور سے ہٹی ہوئی ہے۔ اس تشریح کے اجزاء ترکیبی تو وہی ہیں جو اصلاً خدا کے دین کے ہیں' مگر نئی ترکیب میں اس کا حلیہ اس طرح بگڑ گیا ہے کہ وہ بجائے خود ایک نئی چیز نظر آنے لگا ہے۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۲۱)

ایک اور جگہ خان صاحب فکر مودودی پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیاست' جو اسلام کا ایک جزء ہے' اسے سامنے رکھتے ہوئے کُل اسلام کی ایک نئی تعبیر پیش کی گئی ہے:

''اس تعبیر پر میرا اعتراض دراصل یہ نہیں ہے کہ اس نے سیاست کو اسلام میں کیوں شامل کر دیا۔ سیاست زندگی کا ایک لازمی جزء ہے اور کوئی نظریہ جو انسانی زندگی سے متعلق ہو وہ سیاست سے خالی نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس سے بھی اختلاف نہیں ہے کہ کسی مخصوص وقت میں کوئی اسلامی گروہ سیاست پر کتنی قوت صرف کرے۔ یہ بالکل ممکن

ہے کہ ایک ہنگامی مرحلے میں کسی اسلامی گروہ کو اپنی بیشتر یا ساری قوت سیاسی تبدیلی کے محاذ پر لگا دینی پڑے۔ میرا اعتراض دراصل یہ ہے کہ سیاست جو صرف اسلام کا ایک پہلو ہے' اسی کی بنیاد پر پورے اسلام کی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک چیز اپنی صحیح حیثیت میں حقیقت ہوسکتی ہے لیکن اس کو صحیح مقام سے ہٹا دیا جائے تو ایک صحیح چیز بھی غلط ہو کر رہ جائے گی۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۲۶۶)

ایک اور جگہ ہندوستان کی نسبت پاکستان میں نفاذِ شریعت اور امارتِ اسلامیہ کے قیام کی تحریک کے جواز کی بات کرتے ہوئے خان صاحب لکھتے ہیں:

''اب میں بتاؤں گا کہ مذکورہ بالا تشریح دین کے مطابق اِس وقت کرنے کا کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے۔ وہاں مولانا مودودی قانونِ شریعت کے نفاذ کی جو مہم چلا رہے ہیں اس کو شکلاً میں درست سمجھتا ہوں۔ پاکستان ایک مسلمان ملک ہے اور آزادی کے بعد اصولی طور پر وہاں کی آبادی کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنے یہاں جس طریق زندگی اور جس نظامِ معاشرت کو چاہے رائج کرے۔ ایسی حالت میں پاکستان کی امتِ مسلمہ کا یہ فرض ہوگیا ہے کہ وہ اپنے درمیان اسلامی نظامِ امارت قائم کرے اور اس کے تحت زندگی کے تمام شعبوں کو اسلامی احکام و قوانین کے مطابق منظم کرے۔ تاہم نفاذِ شریعت کی مہم میں حکمتِ تدریج کو ملحوظ رکھنا لازمی طور پر ضروری ہے۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۳۲۸)

ایک اور جگہ ہندوستان اور پاکستان میں سیاسی نظام کے قیام کے امکانات اور منہج کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صحیح بات یہ ہے کہ ایک آزاد مسلم معاشرے کا فرض تو یقیناً یہی ہے کہ وہ اپنے درمیان اسلام کی بنیادوں پر ایک سیاسی نظام قائم کرے' کیونکہ اس کے بغیر معاشرے کے پیمانے پر شریعت کی تعمیل نہیں کی جاسکتی۔ مگر جہاں مسلمان اس حیثیت میں نہ ہوں' وہاں اسلام ان کو خارجی زندگی کے لیے جو پروگرام دیتا ہے' وہ نصبِ امامت نہیں بلکہ انذار و تبشیر ہے۔ اس انذار و تبشیر کی مہم میں جو مراحل بھی پیش آئیں' انھیں اس میں پوری طرح ثابت قدم رہنا چاہیے۔ اگر انھوں نے ایسا کردیا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے لیے ایسے حالات پیدا کرے گا جو انھیں اقتدار حکومت تک لے جانے والے ہوں۔ پہلی صورت میں حکومت قائم کرنا اہلِ ایمان کا فرض ہے۔ دوسری صورت میں حکومت ملنا اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۳۰۶)

ایک اور جگہ فکر مودودی سے پیدا ہونے والے غلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس تعبیر کے مطابق اسلامی مشن کا جو تصور سامنے آتا ہے وہ ہے 'نظام بدلنا'۔ میں مانتا ہوں کہ اسلامی جدوجہد کے مراحل میں سے ایک مرحلہ یہ بھی ہے' مگر اس تعبیر نے اس کو اس کے واقعی مقام سے ہٹا دیا ہے۔'' (تعبیر کی غلطی' ص ۲۷۰)

اسی طرح خان صاحب فکر مودودی میں غلو سے پیدا ہونے والے اراکین کی صفات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوں گے' مگر مسائلِ عالم کے موضوع پر گفتگو کرنے سے ان کی زبان کبھی نہیں تھکے گی۔ نماز کی 'اقامت' سے انھیں کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی' مگر وہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا نعرہ بلند کریں گے۔ ان کی اپنی زندگی میں زبردست خلا ہوں گے' مگر وہ عالمی نظام کے خلا کو پُر کرنے کی باتیں کریں گے۔ ان کا گھر جہاں وہ آج بھی قوام کی حیثیت رکھتے ہیں' اس میں اپنی بساط بھر عام دنیا پرستوں کے گھر کی تقلید ہو رہی ہوگی' مگر ملک کے اندر وہ قوام کی حیثیت حاصل کرنے کی تحریک چلائیں گے تاکہ ملک کو دنیا پرست لیڈروں کے اثرات سے پاک کر سکیں۔ ان کا سینہ خدا کی یاد سے خالی ہوگا' مگر وہ اقتدار حاصل کر کے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی تجویز پیش کریں گے' تاکہ دنیا میں خدا پرستی کا چرچا کیا جا سکے۔ اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے جن اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے' ان پر عمل کرنے میں وہ ناکام رہیں گے' مگر ملکی نظام سے لے کر اقوام متحدہ کی تنظیم تک کی اصلاح کے لیے ان کے پاس درجنوں اصول موجود ہوں گے۔ ان کے کاغذی نقشے اور اخباری بیانات دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ملتِ اسلام کا انھیں کس قدر درد ہے کہ کسی مسئلے کا دور قریب کا رشتہ بھی اگر ملت سے ثابت ہو جائے تو وہ اس کو حل کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں' لیکن قریب جا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اس اظہارِ غم کی حیثیت رسمی تعزیت سے زیادہ نہیں ہے جو مرنے والے کے غم میں نہیں بلکہ صرف اس اندیشے سے کی جاتی ہے کہ زندہ رہنے والوں کو شکایت ہوگی۔ اپنے آج کے حاصل شدہ دائرے میں وہ نہایت سطحی اور غیر ذمہ دارانہ زندگی گزار رہے ہوں گے' مگر اپنی انقلابی تحریک کی کامیابی کے بعد انھیں کام کا جو وسیع تر دائرہ حاصل ہوگا اس کا نقشہ اس طرح پیش کریں گے گویا خلافتِ راشدہ از سرِنو دنیا میں لوٹ آئے گی۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۲۶۷)

ایک اور جگہ مولانا مودودی ؒ کے فکری لٹریچر کی حیثیت کے بارے میں اپنی رائے کا

اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے کہا کہ میرا اصل مسئلہ مولانا مودودی کے لٹریچر کا مسئلہ ہے — انہوں نے کہا اس کا مطلب ہے کہ ہم لٹریچر کو بالکل غلط سمجھیں اور اس کو ترک کر دیں۔ میں نے کہا میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اس کو بالکل غلط سمجھیں اور نہ مکتبہ یا لائبریری میں اس کی موجودگی پر مجھے اعتراض ہے۔ میرا اعتراض دراصل اس کی حیثیت پر ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ جماعت اسلامی کے حلقہ میں اس کی حیثیت یہ بن گئی ہے گویا یہی لٹریچر جماعت اسلامی کی فکر کا مستند ترجمان ہے۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۱۰۰۔۱۰۱)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ 'تعبیر کی غلطی' میں خان صاحب نے فکر مودودی میں غلو اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی نسبت جو توضیحات پیش کی ہیں وہ کافی حد تک درست ہیں اگرچہ بیان میں کہیں کہیں بے جا سختی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی' جبکہ تعبیر کی غلطی لکھی گئی تھی' جماعت کے سینئر رفقاء کی ایک جماعت نے خان صاحب کی اس تنقید کو کھلے دل سے قبول کیا۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''ایک صاحب جو جماعت اسلامی کے ایک شعبہ کے ذمہ دارِ اعلیٰ اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں' انھوں نے کہا: اسپرٹ سے اتفاق tone سے اختلاف۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۳۰۔۳۱)

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد ؒ' جو خان صاحب کی طرح جماعت اسلامی سے فکری اختلافات کی بنا پر علیحدہ ہوئے' نے بھی مولانا مودودی ؒ کی فکر میں اس عدم توازن کو اپنی تحریک' تنظیم اسلامی میں ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ایک طرف اپنی انقلابی تنظیم' تنظیم اسلامی کے کارکنان کے اَذہان وقلوب میں عبادتِ رب کو مقصدِ زندگی اور رضائے الٰہی کو نصب العین بنانے کی فکر کو راسخ کیا تو دوسری طرف اجتماع ومعاشرے کی اصلاح کے ساتھ ساتھ فرد کے تزکیۂ نفس اور ذاتی اصلاح کے عمل کو بھی شد ومد سے موضوعِ بحث بنایا۔

بہر حال خان صاحب اور جماعت اسلامی کے اراکین کی دوطرفہ سختی نے اسے ردِّعمل کا مسئلہ بنا دیا۔ اب ہمارے لیے یہ طے کرنا کہ سختی کا آغاز کس کی طرف سے ہوا' ایک مشکل امر ہے' اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا خان صاحب کی طرف سے ہوئی۔ خان صاحب اپنی سختی کے بارے میں کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری تحریر کا انداز بظاہر سخت ہے۔'' (تعبیر کی غلطی: ص ۱۲۲)

جبکہ دوسری طرف مولانا جلیل احسن ندوی لکھتے ہیں:

’’جناب وحید الدین خان کو میرا سلام کہئے اور یہ کہ میرے اس کارڈ میں اگر کچھ تلخی آ گئی ہو تو واجب ہے ان پر کہ اس کا خیال نہ کریں کیونکہ یہ تلخی خود ان کی پیدا کردہ ہے۔‘‘ (تعبیر کی غلطی: ص ۵۰)

بہرحال سختی اور تلخی پیدا کرنے کا آغاز اگرچہ ’تعبیر کی غلطی‘ کی ۱۹۶۳ء میں پہلی مرتبہ اشاعت عام کی صورت میں خان صاحب ہی کی طرف سے ہوا ہو لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ جماعت اسلامی کی طرف سے اس تلخی کا جواب ’اینٹ کا جواب پتھر‘ کی صورت میں دیا گیا اور اگلے بیس‘ پچیس سالوں میں خان صاحب کے بقول ان کی خوب کھچائی کی گئی۔ ۱۹۸۶ء میں خان صاحب لکھتے ہیں:

’’حقیقت یہ ہے کہ تعبیر کی غلطی میں جس فکر کو زیر بحث لایا گیا ہے وہ علمی میدان میں سراسر شکست کھا چکا ہے‘ مگر اس کے افراد کی عصبیت ان کو اعتراف پر آمادہ نہیں ہونے دیتی۔ اپنی شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ اب وہ اس طرح کر رہے ہیں کہ وہ نہایت منظم طور پر راقم الحروف کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہے ہیں‘ تنقید کے میدان میں اپنے کو عاجز پا کر وہ ’تنقیص‘ کے میدان میں اتر آئے ہیں۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اس طرح وہ اپنے کیس کو مزید کمزور کر رہے ہیں۔ وہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ نہ صرف علمی دیوالیہ پن کا شکار ہیں بلکہ وہ اخلاقی دیوالیہ پن میں بھی مبتلا ہو چکے ہیں۔‘‘ (تعبیر کی غلطی: ص ۱۱)

تیسرا دور

جماعت کی طرف سے اس بیس پچیس سالہ کشاکش نے خان صاحب میں تحریکی اور انقلابی فکر ہی سے اس قدر ردّ عمل پیدا کر دیا کہ انہیں سیاست‘ نفاذِ شریعت‘ جہاد‘ اسلامی تحریک کے عناوین ہی سے چڑ پیدا ہو گئی۔ یہیں سے ان کی شخصیت میں اس فکر کے حوالہ سے عدمِ توازن اور غیر متعدل رویوں کے پروان چڑھنے کا عمل شروع ہوتا ہے اور ردعمل کی یہ نفسیات آہستہ آہستہ بذاتِ خود ایک فکر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ’تعبیر کی غلطی‘ نامی اپنی کتاب جب خان صاحب نے جماعت کے ایک اعلیٰ ذمہ دار کو دکھائی تو انہوں نے بہت خوبصورت تبصرہ فرماتے ہوئے خان صاحب سے کہا:

’’ابوالکلام صاحب‘ مودودی صاحب اور آپ تینوں ایک مشترک غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ کچھ وقتی خرابیوں کا احساس کر کے انھیں دور کرنے کی کوشش کی مگر اصلاح حال کی

کوشش غیر شعوری طور پر تعبیر دین کی کوشش بن گئی۔ جو چیز عملی اصلاح سے متعلق تھی اس کو نظریاتی تشریح کی حیثیت دے دی گئی‘ نتیجہ یہ ہوا کہ افراط وتفریط پیدا ہو گئی‘ توازن باقی نہ رہا۔‘‘ (تعبیر کی غلطی: ص ۳۰۔۳۱)

پس خان صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہ وہ ایک تعبیر دین کی اصلاح کرتے کرتے کچھ خارجی اور داخلی عوامل واسباب سے متاثر ہوئے اور ردّ عمل وضد کی نفسیات کا شکار ہو کر ایک دوسری انتہا پسندی پر جا پہنچے کہ جس کا آغاز قریب قریب ان کی کتاب ’راہِ عمل‘ مطبوعہ ۱۹۹۰ء سے ہوا۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

’’موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں حیرت انگیز طور پر انتہائی ناکامی کا شکار ہوئی ہیں۔ مسلمان جب بھی کوئی تحریک اٹھاتے ہیں تو خدا ان کے گھروندے کو ٹھوکر مار کر گرا دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ تمام سرگرمیاں خدا کی نظر میں بالکل نامطلوب ہیں۔ اس بنا پر وہ ان کو حرفِ غلط کی طرح مٹا رہا ہے۔‘‘ (راہِ عمل: ص ۱۱۰)

۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد تو نفاذ شریعت‘ اقامت دین‘ جہاد اور اسلامی نظام کے حوالہ سے مولانا کے بیانات میں غیر معمولی شدت پسندی نظر آنے لگی۔ ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

’’مگر میں نے ۱۸ اکتوبر کے فوراً بعد یہ کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ بم باری اس مسئلے کا جواب نہیں۔ امریکی مدبرین اس مسئلہ کو سادہ طور پر صرف ٹررزم کا ایک مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا خیال ہے کہ وہ بمبارڈمنٹ کے ذریعہ اس کا خاتمہ کر سکتے ہیں‘ مگر یہ اصل معاملے کا صرف ایک کم تر اندازہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ ’’اسلامک ٹررزم‘‘ ایک ایسے ٹررزم کا نام ہے جس کو ایک مقدس آئڈیالوجی کے ذریعے درست ثابت کیا گیا ہو۔ جو مسلمان سوسائیڈل بم دھماکہ کر کے امریکا کو چیلنج کر رہے ہیں‘ وہ دیوانے لوگ نہیں ہیں —— یہ آئڈیالوجی بلاشبہ صدفی صد غلط ہے‘ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں‘ مگر اس کے پیچھے سو سال سے زیادہ مدت کی لمبی تاریخ ہے۔ سید جمال الدین افغانی‘ حسن البنا‘ سید قطب‘ محمد اقبال‘ آیت اللہ خمینی‘ سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے بہت سے لوگوں نے اسلام کا پولیٹیکل انٹرپریٹیشن کر کے انہیں یہ باور کرایا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا عمل جہاد ہے‘ جہاد کرو اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کی غلط تعبیر پر قائم شدہ اس پولیٹیکل آئڈیالوجی کو ڈسٹرائے کیا جائے۔ یہ گن ورسز گن کا معاملہ نہیں بلکہ گن ورسز آئڈیالوجی کا معاملہ ہے اور اس بے بنیاد آئڈیالوجی کو ڈسٹرائے کر کے ہی ہم اسلام کے نام پر کیے جانے والے ٹررزم کو ختم کر

سکتے ہیں۔‘‘ (وحید الدین خان مولانا‘ ماہنامہ الرسالہ‘ جولائی ۲۰۰۷ء‘ ص ۳۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

’’میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ذاتی طور پر ہزاروں لوگوں کو مسٹر ٹرسٹ کے بجائے مسٹر نیچر بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اسلام کے نام پر موجودہ زمانے میں جو ملیٹنسی چلائی جا رہی ہے‘ اس کا تعلق حقیقی اسلام سے نہیں۔ یہ تمام تر اس جدید لٹریچر کا نتیجہ ہے جس میں اسلام کا پولیٹسائزڈ ورژن (politisized version) پیش کیا گیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کو دوبارہ ڈی پولیٹسائزڈ کیا جائے۔ (ماہنامہ الرسالہ‘ جولائی ۲۰۰۷ء‘ ص ۳۳۔۳۴)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

’’موجودہ زمانے میں انقلاب پسند مسلمانوں کا ایک عمومی نعرہ وہ ہے جس کو شریعت محمدی کا نفاذ کہا جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک خود ساختہ نعرہ ہے۔ اس کی تائید قرآن اور حدیث سے نہیں ہوتی۔ اس کے برحق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اور حدیث میں کوئی حکم اس طرح کے الفاظ میں آیا ہو: نَفِّذ شریعة محمد (شریعت محمدی کو نافذ کرو) اور جب قرآن اور حدیث میں کوئی حکم اس طرح کے الفاظ میں نہ آیا ہو تو اس کی بنیاد پر سیاست چلانا بلاشبہ ایک مبتدعانہ سیاست ہے‘ وہ کوئی اسلامی کام نہیں۔ نفاذِ شریعت کا تصور کوئی سادہ تصور نہیں‘ یہ اسلام کے اندر ایک بہت بڑی برائی داخل کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس تصور نے اسلام کو بزور نفاذ کا موضوع بنا دیا ہے‘ حالاں کہ اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے اختیارانہ پیروی کا نام ہے۔ ’’نفاذ شریعت‘‘ ایک خوبصورت لفظ ہے‘ لیکن عملی نتیجے کے اعتبار سے وہ تخریب کاری ہے‘ اور صرف تخریب کاری۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ اکتوبر ۲۰۰۹ء‘ ص ۲۹)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

’’پاکستان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک منفی ملک کے طور پر وجود میں آیا۔ جس چیز کو پاکستان کے لوگ ’’نظریہ پاکستان‘‘ کہتے ہیں‘ وہ کیا ہے۔ وہ دراصل اینٹی ہندو سوچ کا ایک خوب صورت نام ہے‘ اور اینٹی ہندو سوچ کا مطلب ہے اینٹی مدعو سوچ‘ جو بلاشبہ اسلام میں حرام ہے۔ پاکستان اولاً اینٹی ہندو فکر کے تحت بنا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یہ فکر اینٹی آل فکر (anti all thinking) بن گیا۔ پاکستان کے تمام مسائل دراصل اسی منفی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق‘ اب یہ معاملہ اتنا بڑھ چکا ہے کہ پاکستان میں منفی سوچ کا خاتمہ تقریباً ناممکن ہے —— اب صرف ایک ہی چیز

ممکن ہے‘ وہ یہ کہ افراد اپنے آپ کو اس منفی طوفان سے بچائیں —— میرا مشورہ ہے کہ آپ حقیقت پسند بنیں‘ رومانی تصورات میں جینے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ آپ فکر اقبال اور فکر مودودی کے خول سے مکمل طور باہر آ جائیں‘ ورنہ آپ کے لیے کبھی بھی اپنی اصلاح ممکن نہ ہوگی۔ (ماہنامہ الرسالہ‘ مئی ۲۰۱۱ء‘ ص ۳۹)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

’’قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تخلیق انسانی سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو اس وقت وہاں آدم کے سوا دو مخلوق اور موجود تھی: فرشتے اور جنات۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم لوگ آدم کے آگے جھک جاؤ۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل کی‘ لیکن ابلیس (جنات کا سردار) نے اللہ کے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا‘ وہ اللہ کا باغی بن گیا۔ یہ تاریخ انسانی میں‘ اتھارٹی (authority) کے خلاف بغاوت کا پہلا واقعہ تھا۔ **یہ سیاسی بغاوت یا پالیٹکس آف اپوزیشن بلاشبہ شیطان کی سنت ہے۔ اتھارٹی سے ٹکرائے بغیر اپنا کام کرنا‘ یہ ملائکہ کا طریقہ ہے۔ اور اتھارٹی سے ٹکراؤ کر کے پالیٹکس آف اپوزیشن کا ہنگامہ کھڑا کرنا‘ شیطان کا طریقہ۔** عجیب بات ہے کہ یہ منفی سیاست پوری تاریخ میں مسلسل طور پر جاری رہی ہے‘ اہل ایمان کے درمیان بھی اور غیر اہل ایمان کے درمیان بھی۔ اس منفی سیاست کا یہ براہ راست نتیجہ ہے کہ انسانی تاریخ‘ تعمیر کی تاریخ بننے کی بجائے‘ تخریب کی تاریخ بن گئی۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ مئی ۲۰۱۱ء‘ ص ۱۸۔۱۹)

خان صاحب کو اس انتہا پسندی تک پہنچانے والے عوامل میں سے جماعت اسلامی کے ردّعمل کے علاوہ ان کا اپنا مزاج بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں مزاج کی کچھ خوبیاں اور کچھ کوتاہیاں رکھی ہیں۔ خان صاحب کے مزاج کا ایک اہم وصف ضد بھی ہے۔ ضد میں ایک اعتبار سے مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو کسی کام کے کرنے پر اکسانے اور اس پر ڈٹ جانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پس اس پہلو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض حالات میں ضد انسان کو اس کے مشن میں پُرعزم رکھتی ہے‘ لیکن یہی ضد بے اعتدالی اور غیر متوازن رویوں کا باعث بھی بنتی ہے‘ جیسا کہ ہمیں خان صاحب کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ خان صاحب کی مولانا جلیل احسن ندوی کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جو خط و کتابت ہوئی اس میں مولانا جلیل احسن ندوی لکھتے ہیں:

’’رام پور میں کئی ایک اصحاب سے (میری گفتگو ہوئی تھی) ان سب اصحاب کی یہ متفقہ رائے تھی کہ آپ ایک بات جب اپنے ذہن میں جما لیتے ہیں‘ تو پھر اس میں کسی تبدیلی کے لیے سوچنا بالکل خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ بھائی خدا کرے یہ بات غلط ہو‘ میرا

بھی اندیشہ غلط ہو۔ لیکن اگر بات ایسی ہے جیسی کہ سنی ہے‘ اور جس کا خدشہ آپ کی یہ تحریر دیکھ کر مجھے بھی لاحق ہوا ہے‘ تو یہ طریقہ طالبینِ حق کا طریقہ نہیں ہے‘ اس پر آپ کو سوچنا چاہیے۔‘‘ (تعبیر کی غلطی: ص۴۶)

مولانا ابو اللیث ندوی رحمہ اللہ کے نام ایک خط میں خان صاحب لکھتے ہیں:

’’میرے فکری اختلاف کو دور کرنے کی کوشش تو پوری طرح نہیں کی گئی‘ البتہ اس قسم کی باتیں خوب مشہور ہو رہی ہیں کہ یہ تو ہٹ دھرم آدمی ہیں۔ جس چیز کو پکڑ لیتے ہیں پھر اسے نہیں چھوڑتے۔‘‘ (تعبیر کی غلطی: ص۹۶)

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ خان صاحب جو اس مرحلے تک پہنچے ہیں‘ اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس تاریخی پس منظر کی موجودگی میں اجتماعی اسلامی تعلیمات‘ سیاست‘ نفاذِ شریعت‘ جہاد‘ اسلامی تحریک‘ خلافت و امامت کے حوالہ سے خان صاحب کے خوارجی انتہاپسندی کی حد تک مخالفت کے منہج و رویے کی کوئی گنجائش نکلتی ہے؟ تو اس کا جواب قطعاً نفی میں ہے۔

خان صاحب کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ردّعمل کی نفسیات اور مزاج کی ضد و مخالفت نے خان صاحب کو یہاں پہنچا دیا ہے کہ دنیا جہان کے موضوعات پر وہ بڑے ہی سکون‘ اطمینان اور ٹھہراؤ سے گفتگو کر رہے ہوں گے‘ برے سے برے آدمی میں بھی خیر کا کوئی ممکنہ پہلو دکھا دیں گے‘ لیکن جیسے ہی سیاست‘ خلافت‘ امامت‘ نفاذِ شریعت‘ اسلامی تحریک یا فکرِ مودودی کی بات آئے گی ان کی سوئی ۱۸۰ ڈگری گھوم جائے گی۔ ردّعمل کی نفسیات‘ ضد و مخالفت اور غیظ و غضب سے بھرے ایسے ایسے بیانات جاری کریں گے کہ جن کا صدور کسی صاحب عقل سے عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا‘ مثلاً بدنام زمانہ ہٹلر کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے خان صاحب لکھتے ہیں:

’’میرا اندازہ ہے کہ ہٹلر غیر معمولی صلاحیتوں کا آدمی تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ہٹلر کو آخری زمانے میں یہ احساس ہو گیا تھا کہ جنگ چھیڑنا اس کی غلطی تھی...... ہٹلر کے اندر بے پناہ حد تک قوتِ ارادہ موجود تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ ہٹلر اگر زندہ رہتا تو شاید وہ امن کے لیے کوئی بڑا کام کرتا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ جنوری ۲۰۱۰ء‘ ص۳)

دوسری طرف ایک مسلمان سکالر کی تقریر کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’مغربی دنیا کے ایک مشہور مسلم مقرر نے وہاں کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس میں

خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت‘ خدا کے لیے وفاداری ہے: Rebellion to a tyrant, obedience to God یہ جملہ اسلام کی سیاسی تعبیر کے تحت بننے والے ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ مسلمانوں کی جدید نسل عام طور پر اس سیاسی تعبیر سے متاثر ہے۔ آج کی دنیا میں جگہ جگہ اسلامی انقلاب کے نام پر جو ہنگامے جاری ہیں‘ وہ اسی سیاسی فکر کا نتیجہ ہیں۔ اس قسم کی نام نہاد انقلابی سیاست ہر گز اسلامی سیاست نہیں ہے۔ **اگر شدید لفظ استعمال کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ یہ اسلام کے نام پر ایک شیطانی سیاست ہے۔ اس سیاست کا بانی اول خود شیطان ہے۔ آج جو لوگ اس قسم کی سیاست کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں‘ وہ بلاشبہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں‘** نہ کہ اسلام کی پیروی۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ مئی ۲۰۱۱ء‘ ص۱۸)

خان صاحب کی اسلام کے تصورِ سیاست‘ اقامت دین اور نفاذِ شریعت کے بارے میں ان کے تیسرے فکری دور کی یہ تعبیر سراسر بے بنیاد اور کتاب و سنت کی صریح و مبین تعلیمات کے خلاف ہے۔ ظالم‘ چاہے مسلمان ہو یا کافر‘ اس کے خلاف جنگ اور قتال کا حکم کتاب اللہ کا حکم ہے۔

قتال کی علت ’ظلم‘ ہے اور قتال ہوتا ہی ’ظالم‘ کے خلاف ہے۔ چاہے وہ ظالم‘ کافر ہو یا مسلمان۔ جیسا کہ آیاتِ قرآنیہ ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ﴾ (الحج: ۳۹) ’’(قتال) کی اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن سے قتال کیا جا رہا تھا اس سبب سے کہ ان پر ظلم ہوا ہے‘‘ اور ﴿وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا ﴿۷۵﴾﴾ (النساء) ’’اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں قتال نہیں کرتے حالانکہ کمزور مرد‘ عورتیں اور بچے یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال کہ جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی سرپرست بنا اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار بنا‘‘ اس بات کی دلیل ہیں کہ ظالم کافر سے قتال واجب ہے۔

اسی طرح آیت مبارکہ ﴿فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ۚ﴾ (الحجرات: ۹) ’’پس تم لڑائی کرو اس جماعت سے جو ظلم کرتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے‘‘ اس بات کی دلیل ہے کہ ظالم مسلمان کے ساتھ بھی قتال واجب ہے۔ علاوہ ازیں آیت مبارکہ ﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ (الشوریٰ) ’’اور وہ

لوگ کہ جن کے ساتھ اگر زیادتی یا ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں'' اور ﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ (البقرة:١٩٤) ''پس جو کوئی تم سے زیادتی کرے تو تم بھی اس سے اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی کہ اس نے تمہارے ساتھ کی ہے'' جیسی آیات سے بھی ظالم مسلمان حکمران سے قتال کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر مسلمانوں کی باہم قتال کرنے والی دو جماعتوں کے مابین کوئی معاہدہ یا مصالحت ہو جائے تو اب اس معاہدے کی اگر کوئی جماعت خلاف ورزی کرے تو بھی اس جماعت سے قتال قرآن کی آیت ﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ (الحجرات:٩) ''اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کراؤ۔ پس اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر ظلم و زیادتی کرے تو اس ظلم و زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے'' کے تحت جائز ہے۔

لیکن ان آیات کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ انسان کے پاس بدلے کی اہلیت و استطاعت نہ ہو اور پھر بھی وہ ظلم کا بدلہ لینے چل پڑے اور اس طرح اپنا مزید نقصان کر لے۔ یہ خطاب انہی لوگوں سے ہے جو ظلم کا بدلہ لینے کی استطاعت و صلاحیت رکھتے ہیں اور منظّم ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب تک بدلہ لینے کی استطاعت و صلاحیت نہ تھی اس وقت بھی ظلم ہو رہا تھا لیکن صبر و مصابرت اور ہاتھ روکنے کا حکم تھا۔ جیسا کہ قرآن کی آیت ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ......﴾ (النساء: ٧٧) ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کہا گیا تھا کہ تم اپنے ہاتھ باندھے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوة ادا کرو' پس جب ان پر قتال فرض کیا گیا......'' میں اس بات کی طرف صریحاً اشارہ ہے کہ پہلے ظلم کے مقابلے میں ہاتھ نہ اٹھانے کا حکم تھا' پھر بدلہ لینے کی اجازت بھی نازل ہو گئی۔ لہٰذا ظلم کے جواب میں صبر و مصابرت اور ظلم کے جواب میں بدلہ لینا دونوں ہی اسلام کے منہج ہیں اور تا حال جاری ہیں۔

لہٰذا معاصر حالات میں علماء' طالبانِ دین اور مصلحین پر یہ فرض ہے کہ اپنے ملک کے حکمرانوں اور اصحاب اقتدار کو ہر آئینی' احتجاجی' قانونی' لسانی' علمی' اخلاقی اور تحریری ذرائع و وسائل' اخبارات' رسائل و جرائد' الیکٹرانک میڈیا' جلسے جلوسوں' دھرنوں' سیمینارز اور کانفرنسوں

کے انعقاد' اجتماعی مباحثوں اور مکالموں اور عوامی دباؤ کے ذریعے نفاذِ شریعت اور اقامت عدل وقسط پر مجبور کریں' اور اگر پھر بھی حکمران اس فریضہ کی ادائیگی سے انکار کریں تو مذکورہ بالا تمام پر امن کوششوں کے ذریعے ان حکمرانوں کی معزولی اور ان کی جگہ اس عہدے کی اہلیت رکھنے والے اصحاب علم و فضل کی تقرری' علماء اور داعیانِ حق کا بنیادی فریضہ ہو گا۔ ظالم حکمران کے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنا خدائی حکم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ﴾ (النساء:١٤٨)

''اللہ تعالیٰ بلند آواز میں برائی کا تذکرہ پسند نہیں فرماتا مگر اس کے لیے جو مظلوم ہو۔''

اسی طرح نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَفْضَلُ الْجِهَادُ کَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ)) (سنن أبی داوٗد' کتاب الملاحم' باب الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر)

''افضل جہاد ظالم حکمران کے خلاف کلمہ حق کہنا ہے۔''

ایک اور روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ' ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ' فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِیَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) (صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان)

''مجھ سے پہلے کسی قوم میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی نبی ایسا نہیں بھیجا کہ جس کے ایسے حواری اور ساتھی ایسے نہ ہوں جو اس کے طریقے کے مطابق چلتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد کچھ ناخلف قسم کے لوگ ان کے جانشین بنتے تھے جو ایسی باتیں کہتے تھے کہ جن پر خود عمل نہیں کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے کہ جس پر عمل کرنے کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا۔ پس جس نے ان [حکمرانوں] کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے' اور جس نے ان کے ساتھ اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے' اور جس نے ان کے ساتھ اپنے دل سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے۔ اور اس

کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

خان صاحب اسلامی تحریکوں کو یہ الزام دیتے نظر آتے ہیں کہ یہ انقلابی تحریکیں عوام پر جبراً اسلام مسلط کرنا چاہتی ہیں جبکہ وہ تو اختیار کا معاملہ ہے۔ ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ چند افراد پر مشتمل مسلمان حکمران خاندانوں یا مارشل لاء ڈکٹیٹروں نے ملک کے مذہبی حلقوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ آئین و قانون کے نام پر عوام الناس پر ان کی مرضی کے خلاف اپنے ملحدانہ اور کفریہ نظریات کو کبھی فلاں ایکٹ کے نام پر اور کبھی 'تحفظ حقوقِ نسواں بل' کی آڑ میں جبراً نافذ کرنا یا بے گناہ مسلمان عوام کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے ہاتھوں چند ڈالروں کے عوض بیچ دینے کو کیا آزادی و مساوات کا نام دیا جائے؟ بیروزگاری کے عفریت' معاشی بدحالی' فقر و فاقہ کے نتیجے میں خودکشیاں' غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ' جرائم کی کثرت' عدالتوں میں انصاف کا بحران' پولیس اور لینڈ مافیا کا ظلم و ستم' امن و امان کی تباہی' انٹرنیٹ اور کیبل کی صورت میں عریانی و فحاشی کا سیلاب' وڈیرہ شاہی' جاگیردارانہ نظام' کرپشن' رشوت خوری' چوری و ڈکیتی' زنا و گینگ ریپ' عورتوں کو زندہ دفن کر دینا' غیر انسانی طبقاتی تقسیم' منشیات و شراب کی سرعام فروخت' گلی کوچوں اور سڑکوں پر ڈاکوؤں کی قتل و غارت اور عامۃ الناس پر ظلم و ستم کی انتہا کرنے والی لسانی و علاقائی تنظیمیں' کیا مسلمان عوام یہ سب کچھ چاہتی ہے؟ اگر نہیں تو اس کو ان پر مسلط کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ حکمرانوں کا ظالمانہ اور کرپشن پر مبنی ناقص نظام یا اسلامی تحریکیں؟

ہمارے نزدیک دین کا تقاضا یہ ہے کہ علمائے کرام' دینی جماعتیں اور ان کے کارکنان' دینی و دنیوی مدارس و جامعات کے طلبہ اور عوام الناس ظالم حکمرانوں کے خلاف ملک گیر سطح پر پُرامن جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کریں۔ عوام الناس کی رائے ہموار کریں۔ سٹریٹ پاور بڑھائیں' اسلامی نظامِ عدلِ اجتماعی کے نفاذ تک مظاہرے کریں۔ امریکہ کی حمایت ختم کرنے کے لیے حکومتِ وقت کے خلاف دھرنے دیں۔ ظالم حکمرانوں کی معزولی کی خاطر پُرعزم لانگ مارچ کریں۔ پاکستان کی پاک سرزمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے ہر پُرامن جدوجہد اختیار کریں اور نتائج اللہ کے حوالے کر دیں۔

اگلی قسط میں ہم ان شاء اللہ خان صاحب کے تصورِ امن' تصورِ جہاد اور شاتم رسول اور غلام احمد قادیانی کے بارے میں خان صاحب کے نقطہ نظر کو موضوع بحث بنائیں گے۔

(جاری ہے)

بقیہ : عرضِ احوال

وہ جیتا یا وہ جماعت جیتی جس کے مخالف ملک میں ۶۸ فیصد ہیں۔ پھر پاکستان جیسے ملک میں یہ نمائندہ حکومت اپنی کرتوتوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے مزید غیر مقبول ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ حکومت اپنے ملک کے دفاع کی مضبوطی کا باعث بنے گی جو عوام کی خدمت کی وجہ سے اور عدل و انصاف قائم کر کے عوام میں ہر دلعزیز ہوگی۔ آج دنیا اِس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ جس فوج کی پشت پر عوام ہوگی اُسے شکست نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی بدترین شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عوام جنگ سے لاتعلق تھی۔

(۵) اچھی حکمت عملی اور منصوبہ بندی: ملکی دفاع کے حوالہ سے کوئی حکومت اگر اچھی حکمت عملی اپنائے گی اور بروقت منصوبہ بندی کرے گی تو وہ بھی حصول مقصد میں کامیاب رہے گی اور ملک کا دفاع احسن طریقے سے کر سکے گی۔ اِس حوالہ سے بھی پاکستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اچھی حکمت عملی اور بروقت منصوبہ بندی کا فقدان نظر آئے گا۔ ۱۹۶۵ء میں ہم نے کسی پلاننگ کے بغیر اور دشمن کے ردعمل کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فوجی کمانڈوز مقبوضہ کشمیر میں داخل کر دیے۔ مقامی لوگوں کے عدم تعاون کی وجہ سے وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے تو سوچے سمجھے بغیر کشمیر پر حملہ کر دیا گیا۔ کچھ سرحدی کامیابیاں حاصل کیں' لیکن جب بھارت نے لاہور کا محاذ کھول دیا تو ہمیں کشمیر بھول گیا' پاکستان بچانے کی فکر لاحق ہوگئی۔ اگرچہ ہم پاکستان کو بچانے میں کسی قدر کامیاب ہو گئے' لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ حصولِ کشمیر کا معاملہ اُلٹا ہمارے گلے پڑ گیا۔ اسی طرح ہم نے منصوبہ بندی کے بغیر کارگل میں مہم جوئی کی اور بعد ازاں اُس جنگ سے جان چھڑانی مشکل ہوگئی۔ امریکہ کے منت ترلے کر کے جنگ رکوائی گئی۔ لہٰذا کسی قوم کو اپنے دفاع کے لیے بہادر اور جرأت مند فوج' جدید ترین اسلحہ اور دیگر جنگی وسائل کے علاوہ مذکورہ بالا اوصاف کا حامل بھی ہونا چاہیے۔ لیکن ایک شے مسلمان قوم کے لیے لازم اور اہم ترین ہے کہ وہ اِن وسائل اور اوصاف کو خود میں جمع کرے لیکن اِن پر بھروسہ ہرگز ہرگز نہ کرے' بلکہ بھروسہ صرف اور صرف اللہ کی ذات پر کرے۔ ایمان اور یقین محکم ہی اِس کی اصل قوت ہے۔ آج دنیوی وسائل کے حوالے سے ہمارے پاس سب کچھ ہے لیکن ہم پر دشمن کا خوف اور ہیبت طاری ہو چکی ہے۔ ہمارا دفاع ٹوٹ رہا ہے' یقیناً ٹوٹ رہا ہے۔ اِس لیے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہیں کر رہے۔ ہم زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں لیکن قلب اُس کی تصدیق نہیں کر رہا۔ ایمان عمل میں ڈھل نہیں رہا۔ وگرنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ پاکستان میں ۹۷ فیصد مسلمان ہوں اور پاکستان اسلامی فلاحی ریاست نہ بن سکے' پاکستان میں محمد ﷺ کی شریعت نافذ نہ ہو سکے۔ ایک گروہ تو صاف صاف منحرف ہو چکا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں دفاع کیسے ممکن ہوگا جب عمارت ہی بنیاد سے الگ کر کے کھڑی کر دی جائے گی؟ دفاعِ پاکستان کو ناقابلِ تسخیر ایٹم بم نہیں بنا سکتا' وہ نظریہ بنا سکتا ہے جو اِس ریاست کی بنیاد تھا۔ اُس نظریہ کو عملی تعبیر دینے کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ' دفاع کے تمام تقاضے پورے ہو جائیں گے' ان شاء اللہ!